کلامِ نیرنگ

میر غلام بھیک نیرنگ

مرتبہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل

کلامِ نیرنگ

میر غلام بھیک نیرنگ

مرتبہ

ڈاکٹر معین الدین عقیل

مکتبہ اسلوب کراچی

اشاعت اوّل ۱۹۰۷ء

اشاعت دوم ۱۹۱۷ء

اشاعت سوم
مع غیر مدون کلام } ۱۹۸۳ء

کتابت مظفر حسین گجراتی

تعداد ایک ہزار

طابع حقی آفسٹ پریس
لیاقت آباد۔ کراچی

مکتبہ اسلوب

پوسٹ بکس ۲۱۱۹ - کراچی ۱۸

فہرست

کلامِ نیرنگ

منظومات

غزلیات

غیر مدون کلام

منظومات

غزلیات

پیش لفظ

میر نیرنگ ہماری قومی اور ادبی تاریخ کی ان نابغۂ روزگار شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے اپنی ساری زندگی بھرپور علمی و ادبی اور قومی و سیاسی سرگرمیوں میں گزار دی اور اپنے دور کی قومی اور ادبی زندگی پر ہمہ گیر اثرات چھوڑے۔ لیکن وہ قوم کے ان محسنین میں سے بھی ہیں جنھیں قوم بہت جلد فراموش کر دیتی ہے۔ ہماری قومی اور ادبی تاریخ کے جائزوں میں انھیں وہ جگہ نہ مل سکی جس کے وہ فی الحقیقت حق دار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگر ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا جائزہ لینا مقصود ہو تو مآخذ اور مواد کی کمی ہر جگہ محسوس ہوتی ہے۔ میر نیرنگ بھی ان معاملات میں بڑے بے نیاز رہے۔ چنانچہ انھوں نے خود کوئی ایسا اہتمام نہ کیا جس سے ان کے خاندان، ان کی زندگی اور ان کی قومی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات مرتب ہو سکیں۔ ان موضوعات پر جو کچھ بھی معلومات ملتی ہیں وہ یا تو خاندانی روایات پر مبنی ہیں یا پھر ہماری قومی و سیاسی اور ادبی زندگی کے منتشر اوراق پر بکھری ہوئی ہیں جنھیں یکجا کرنا اور مربوط کرنا ہر لحاظ سے ایک دشوار گزار اور دقت طلب کام ہے۔

زیرِ نظر کتاب میر نیرنگ کے کلام کو یکجا کرنے کی ایک کوشش پر مشتمل ہے۔ گو میر نیرنگ ایک خوش فکر اور مشاق شاعر تھے اور علامہ اقبال کے معاصرین میں انھیں خصوصیت بھی حاصل تھی لیکن قومی اور سیاسی مشاغل میں الجھ کر وہ شاعری سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "کلام نیرنگ" دو مرتبہ، پہلے ۱۹۰۷ء میں اور پھر قدرے اضافوں کے ساتھ، ۱۹۱۷ء میں، شائع ہوا، لیکن پھر ان کی زندگی میں، جو اس دوسری اشاعت کے بعد کے ۳۵ برسوں پر محیط ہے، اس کی کوئی اور اشاعت سامنے آئی اور نہ کوئی نیا مجموعہ مرتب ہوا۔ اس عرصے میں میر نیرنگ نے شاعری کی طرف بہت کم توجہ دی اور اگر اس دوران میں ان کی کچھ چیزیں ملتی ہیں تو ان کا ایک بڑا حصہ ان نظموں پر مشتمل ہے جو انھوں نے مختلف قومی اداروں کی تقریبات کے لیے لکھی تھیں۔ ان کی تمام تر دلچسپیاں سیاسی اور تبلیغی جد و جہد کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس زمانے میں انھوں نے جو کچھ تخلیقی کام کیے وہ بہت کم دستیاب ہیں۔ یا تو وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہے یا پھر مختلف اخبارات و جرائد کے صفحات پر بکھرے ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں ان کے ایسے کلام کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زیرِ نظر مجموعے میں ان کا تمام غیر مدون کلام شامل ہے۔ بہت سی تخلیقات ایسی ہوں گی جن تک راقم کو رسائی حاصل نہیں ہو سکی۔

اس مجموعے کی ترتیب بنیادی طور پر "کلام نیرنگ" کی دوسری اشاعت کے مطابق رکھی گئی ہے اور جو غیر مدون کلام دستیاب ہوا ہے اسے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔ حواشی میں مآخذ کی نشاندہی کر دی گئی ہے لیکن وہ غیر مدون کلام، جس پر کوئی حوالہ نہیں، وہ دختر میر نیرنگ بیگم ڈاکٹر سید ظفر الحسن سے حاصل ہوا ہے۔ قومی اداروں کے جلسوں میں پڑھی جانے والی منظومات ان اداروں کی مطبوعات یا رودادوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

حواشی زیادہ تر میں نے ہی لکھے ہیں، لیکن وہ حواشی جنھیں میر تیر نگ نے لکھا تھا انھیں متعلقہ مقامات پر میر تیر نگ کے نام سے درج کر دیا گیا ہے۔

یہ مجموعہ میر تیر نگ کو یاد کرنے اور قوم کو ان کی یاد دلانے کی ایک صورت ہے۔ اس ترتیب و اشاعت بیگم ڈاکٹر ظفر الحسن کی شدید خواہش کے نتیجے میں عمل میں آ رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ جب یہ کتاب طباعت کے آخری مراحل میں تھی، ان کا انتقال ہو گیا ــــــ اور وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کو نہ دیکھ سکیں۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ میر تیر نگ کی تمام نثری تحریریں بھی مرتب ہو کر شائع ہو جائیں۔ علمی، ادبی، قومی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ان کی متعدد تحریریں ہیں جو مختلف مجموعوں اور ہماری قومی اور ادبی صحافت کے قدیم اور خستہ اوراق پر بکھری ہوئی ہیں۔ ایسی تحریریں دیگر علم دوست حضرات کی بھی توجہ چاہتی ہیں۔ میری بھی خواہش ہے کہ ایسی تحریریں یکجا ہو کر محفوظ ہو جائیں ــــــ کیونکہ یہ سب ہماری قومی اور ادبی زندگی کے ایک باب کا احاطہ کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب کے مقدمے میں دی گئی معلومات اور غیر مدون کلام کی فراہمی میں میرے بعض دوستوں نے بھی کرم فرمائی کی ہے۔ اس ضمن میں لاہور سے پروفیسر احمد سعید، پروفیسر اقبال مجددی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور قاضی افضل حق قرشی صاحبان اور جھنگ سے پروفیسر جہانگیر عالم صاحب نے معاونت فرمائی ہے۔ میں ان تمام حضرات کا ممنون ہوں۔ خاص طور پر پروفیسر احمد سعید صاحب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے، جن کا اس سلسلے میں مستقل تعاون مجھے حاصل ہوا ہے۔ میں سید محمد بشیر رضوی (ولد سید صدیق حسن رضوی) برادر زادہ میر تیر نگ کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے میر تیر نگ کے بارے میں ایک تحریری یادداشت عنایت کی۔

اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میر تیر نگ کے نواسوں جناب سید احمد صاحب، (جنھیں مرحوم کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے) سید محمد خالد صاحب، سید علی صاحب اور جناب عقیل ظفر الحسن کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے کتاب کی ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں آسانیاں پیدا کیں۔

معین الدین عقیل

یکم جنوری ۱۹۸۲ء ۔ ۴۸۳/۵۱ ۔ بی ۔ کورنگی ۔ کراچی ۳۱

مقدمہ

میرا جی نیرنگ دورانہ، تحصیل و ضلع انبالہ[1] میں ستمبر ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے[2]۔ اصل نام غلام محی الدین تھا، جسے دورانہ سے قریب ایک مقام ٹھسکہ کے ایک صوفی بزرگ جناب میراں بھیکھ[3] سے عقیدت کی نسبت سے تبدیل کر کے غلام بھیک رکھا گیا[4]۔ نسباً سید تھے اور سلسلۂ نسب امام علی رضاؑ سے ملتا ہے۔ جن کا مسکن ایران کا شہر ترمذ تھا۔ میر نیرنگ کے جد اعلیٰ سید عبدالکریم رضوی ترمذ سے آکر ۸۰۰ھ میں دورانہ میں مقیم ہوئے۔ اس وقت سے یہ مقام میر نیرنگ کا آبائی وطن ہے[5]۔ میر نیرنگ کے دادا سید فتح علی علوم دینیہ اور عربی و فارسی زبانوں کی تدریس کے لحاظ سے اپنے علاقہ میں خاصے مشہور تھے۔ میر نیرنگ کے والد سید قاسم علی ایک نیک طینت اور دین دار بزرگ تھے اور انھیں اپنے علاقہ میں عزت و احترام حاصل تھا۔ تعلیم واجبی تھی لیکن عربی و فارسی زبانوں اور علوم دینیہ میں دسترس حاصل تھی۔ حافظ قرآن تھے اور تصوف سے لگاؤ تھا۔ اس کے اعمال و اشغال میں مصروف رہتے تھے۔ طبیعت میں انکسار اور فقر و استغنا کی صفات بھی موجود تھیں۔ زمینداری ذریعۂ معاش تھی — جو انھیں جد اعلیٰ سے ورثہ میں ملی تھی۔ گو اس میں سوا گاؤں بشمول دورانہ شامل تھے، لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد یہ صرف ایک گاؤں پر منحصر رہ گئی تھی۔ زمینداری کے ساتھ ساتھ دینداری بھی اس خاندان کی وجہ شرف تھی۔ سید ابوالحسن سدا بہار اس خاندان میں ایک برگزیدہ دیندار بزرگ کی حیثیت سے ممتاز اور معروف ہوئے۔ سید قاسم علی نے ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔ ان کے پس ماندگان میں میر نیرنگ کے علاوہ دو اور فرزند اور ایک

---

[1] یہ انبالہ سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ایک موضع ہے جسے ایک ہندو جاگیردار دیو راتا نے آباد کیا تھا۔

[2] میر نیرنگ بنام محمد عبداللہ خویشگی، مورخہ ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء مشمولہ "بوستان قلم" مرتبہ محمد عبداللہ خویشگی، (کراچی ۱۹۶۲ء) ص ۶۳-۶۴۔ قمری تاریخ ۷ رمضان المبارک تھی، بحوالہ ایضاً، اس حساب سے میر نیرنگ کی تاریخ پیدائش ۲۶ ستمبر مطابق ۷ رمضان المبارک ۱۲۹۳ھ تھی۔

[3] حالات کے لئے: غلام سرور لاہوری "حدیقۃ الاولیاء" مرتبہ محمد اقبال مجددی (لاہور ۱۹۷۶ء) ص ۹۹-۱۰۱

[4] مطابق یادداشت۔ سید محمد مبشر رضوی۔

[5] میر نیرنگ بنام محمد عبداللہ خویشگی، مشمولہ "بوستان قلم" ص ۶۳

دختر تھیں۔ دختر سب سے بڑی تھیں جو اپنے چچا زاد بھائی سید غلام شبیر کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ فرزندوں میں میرنیرنگ سب سے بڑے تھے۔ باقی دو فرزند سید صدیق حسن رضوی اور سید شریف حسین رضوی میرنیرنگ سے علی الترتیب پانچ اور بارہ سال چھوٹے تھے۔ سید صدیق حسن رضوی دفترِ خارجہ سے منسلک ہوئے اور عرب ممالک اور قندھار میں قونصل کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ریاستِ الور میں بطور وزیر اہم خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کا انتقال پاکستان میں ہوا۔ میرنیرنگ کی والدہ بھی اپنے شوہر کی طرح دیندار اور نیک طینت خاتون تھیں۔

میرنیرنگ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ دینداری اور شعائرِ اسلامی سے عبارت تھا۔ روحانیت اور تصوف کے مشاغل عام تھے۔ خاندان کے بزرگوں سے وابستہ متعدد کرامات خاندان میں زبان زد عام ہیں۔ گو میرنیرنگ نے والد کی صحبت سے زیادہ عرصہ تک فیض نہیں اٹھایا لیکن فقر و قناعت اور مذہب سے قلبی لگاؤ ان کے والد اور ان کے خاندان کے عام اثرات کو ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے والد کے روحانی تصرفات اور ریاضتوں اور مجاہدوں کا اثر ان کی زندگی میں سخت کوشی، قومی اور ملی مسائل سے نبرد آزمائی، جذب و شوق اور جہدِ مسلسل جیسی صفات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ زندگی بھر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مسلسل سعی و کاوش میں مصروف رہے۔ گو ان کی زندگی میں ایک مختصر دور ایسا بھی آیا جس کے بارے میں بعض قیاس آرائیاں پائی جاتی ہیں۔ بہر حال ساری زندگی وہ مثبت اور مفید قومی و ملی اور علمی کاوشوں میں منہمک رہے اور ان کی زندگی ایک راست باز اور ہمدردِ قوم رہنما، پرجوش مذہبی مبلغ، ایک پرخلوص اور سچے دوست اور ایک خوش فکر شاعر اور ادیب کا نمونہ پیش کرتی رہی۔

میرنیرنگ کا بچپن کسی امتیازی خصوصیت کا حامل نہیں تھا، یہ عام بچوں کی مانند گزرا۔ کوئی غیر معمولی بات یا کوئی انوکھا واقعہ اس دور سے یادگار نہیں ہے۔ شرافت اور پاکبازی، جو ان کے خاندان اور ان کے ماحول کا خاصہ تھا، ان کا بچپن بھی اسی سے عبارت رہا۔ دینداری اور دینی علوم کی طرف توجہ گھریلو ماحول کا لازمی نتیجہ تھی۔ دینی

لـه یہ عرصہ سات آٹھ سال پر محیط ہے ـــــ جو ان کا عہدِ شباب تھا۔ انبالہ میں میرنیرنگ کے ایک ہمسایہ سید نور اللہ شاہ سے روایت ہے کہ میرنیرنگ ' یکے از زنان بازاری '' جانو '' کے عشق میں مبتلا ہو گئے تھے، جو انبالہ میں رہتی تھی ـــــ بحوالہ عابد علی عابد، "شعر اقبال" (لاہور، ۱۹۶۴ء) ص ۲ ـــــ اس سلسلے میں سید محمد بشیر حسن رضوی کا بیان یہ ہے کہ میرنیرنگ نے اپنے چھوٹے بھائی سید صدیق حسن رضوی کی شادی کے موقع پر محفلِ موسیقی کا اہتمام کیا تھا جو اس زمانے کے دستور کے مطابق تھا۔ اس محفل میں جانو بھی آئی تھی۔ اپنی قدر افزائی کے باعث وہ بعد میں بھی میرنیرنگ کے گھر آتی رہی۔ یہ سلسلہ کچھ طویل ہونے لگا تو فیصلہ کیا گیا کہ جانو تائب ہو کر میرنیرنگ سے نکاح کر لے۔ نکاح ہو گیا، لیکن جانو زیادہ عرصے تک عائلی زندگی کی پابندیاں نباہ نہ سکی۔ اس لیے میر صاحب نے اُسے آزاد کر دیا۔

قرآن، دینی علوم سے ابتدائی واقفیت اور ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ قرآن کی تعلیم والدہ ماجدہ نے دی اور اس کے بعد چچا زاد بھائی سید غلام شبیّر سے علومِ دینیہ اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ ایسی کوئی خاندانی روایت موجود نہیں کہ جس سے حصولِ علم میں میر نیرنگ کی بہت زیادہ دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہو، بلکہ ایک مرتبہ تو انھوں نے تعلیم سے اپنی عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مزید تعلیم کے حصول سے انکار بھی کر دیا تھا، لیکن اپنے چچا زاد بھائی سید غلام شبیّر کے ایک مصلحت آمیز رویہ کے سبب کہ جس میں کھیتی باڑی کے پرمشقت کام میں لگائے جانے کی خاندانی روایات موجود ہیں ؎، میر نیرنگ کھیتی باڑی کی مشقت سے گھبرا کر دوبارہ تعلیم کے حصول کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر بہت دلچسپی اور لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ان کی یہ دلچسپی ہمیشہ برقرار رہی اور وہ اس میں امتیاز حاصل کرتے رہے۔

ابتدائی گھریلو تعلیم و تربیت کے بعد مروجہ تعلیم کے لیے دورانہ میں انتظام نہ ہونے کی وجہ سے انھیں ٹھروہ بھیجا گیا، جہاں ایک مڈل اسکول موجود تھا ؎۔ یہ قصبہ چونکہ دورانہ سے بہت قریب تھا اس لیے میر نیرنگ دورانہ سے روز اسکول کے لیے جاتے تھے۔ یہ مشقت ان کی کم سنی کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی ــــ اور پھر ایسی روایتیں بھی موجود ہیں کہ میر نیرنگ حصولِ علم میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ گھر کے شور و غوغا سے بچنے کے لیے گھر سے باہر نکل جاتے اور رات گئے تک کسی مسجد میں بیٹھے چراغ کی روشنی میں محوِ مطالعہ رہتے۔ ٹھروہ کے بعد میر نیرنگ انبالہ کے میونسپل بورڈ ہائی اسکول میں داخل ہوئے۔ پھر انگریزی سیکھنے کے شوق کی تکمیل انبالہ کی تحصیل جگادھری کے مشن ہائی اسکول اور انبالہ کے مشن ہائی اسکول اور گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ میں کی ؎۔ اپنے ذوق اور لگن کی وجہ سے انٹرنس کے امتحان میں، جو انھوں نے مشن ہائی اسکول انبالہ سے ۱۸۹۵ء میں دیا، وہ پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے ؎۔ یہ کامیابی ان کی اعلیٰ ذہانت اور محنت کا واضح ثبوت تھی۔

میر نیرنگ کے معاشی حالات، والد کی وفات کے باوجود بہت خراب نہیں تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے ایک چچا سید ہاشم علی رضوی نے ان کی تعلیم و تربیت اور دیکھ بھال کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ کفالت کے لیے آبائی زمین موجود تھی، اس کی دیکھ بھال بھی وہی کرتے تھے۔ زندگی آسائشوں سے بے نیاز اور خودداری

؎۔ ایسی اور دیگر متعدد خاندانی روایات کو سید قاسم حسین رضوی نے اپنے مذکورہ مقالہ میں یکجا کیا ہے۔

؎۔ سید منظور حسین رضوی سے روایت ہے کہ اس اسکول کے صدر مدرس نے ایک مرتبہ میر نیرنگ سے کہا تھا کہ "میاں تمھیں اس اسکول میں ضرور آنا چاہیے کیونکہ تمھارے بزرگ بھی اسی اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میر نیرنگ کا لہجہ فخریہ ہو گیا تھا ـــــ بحوالہ ایضاً۔

؎۔ "THE INDIAN YEAR BOOK 1947" (بمبئی ۱۹۴۷ء) ص ۱۱۶۴

؎۔ میر نیرنگ "اقبال کے بعض حالات" مشمولہ مطالعۂ اقبال مرتبہ گوہر نوشاہی (لاہور ۱۹۷۱ء) ص ۱۹

اور سلیقے کے ساتھ گزرتی ہے۔ انٹرنس میں کامیابی کے بعد اس زمانہ کے عام رواج کے مطابق نوجوانی ہی میں شادی کردی گئی۔ ان کے دوسرے چچا سید منصب علی رضوی کی دختر ان کے عقد میں آئیں۔ وہ ایک پاکیزہ، سادہ مزاج، وفا شعار اور سلیقہ مند بیوی بیان کی جاتی ہیں۔ انھوں نے میر نیرنگ کو گھریلو مسائل سے ہمیشہ بے نیاز رکھا اور اسی وجہ سے میر نیرنگ مکمل توجہ اور دل جمعی کے ساتھ اپنے علمی و قومی کاموں میں منہمک رہے۔ میر نیرنگ کی اولاد میں صرف ایک دختر تولد ہوئیں جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن[۱۰] کی شریکِ حیات بنیں۔

میر نیرنگ انٹرنس میں کامیابی کے بعد اسی سال (۱۸۹۵ء) گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ یہاں بہت جلد کئی لائق طلبہ ان کے دوست بن گئے، جن میں علامہ اقبال، چودھری جلال الدین وغیرہ سر فہرست ہیں۔ میر نیرنگ نے امتیازی حیثیت میں بی اے کا امتحان بھی کامیاب کرلیا تو انھیں ایم اے کے لیے وظیفہ مل گیا[۱۱] اس عرصہ میں ان کے معاشی حالات نے انھیں مضطرب کیے رکھا۔ اور خصوصاً ان کے دو چھوٹے بھائیوں کی تعلیم کی ضرورت نے مزید تحصیل علم کے شوق کو مسدود کرکے انھیں مجبور کیا کہ وہ اپنے روزگار کے لیے بھی سوچیں۔ چنانچہ انھوں نے بی اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ قانون کے دو امتحان بھی پاس کرلیے۔ وہ چاہتے تھے کہ قانون کا آخری امتحان بھی کامیاب کرلیں تاکہ وکالت کرسکیں۔ اس لیے صرف اس مقصد سے کہ انھیں وظیفہ ملتا رہے، انھوں نے ایم اے میں داخلہ لیا مگر چونکہ انھیں احساس تھا کہ شاید وہ حصولِ علم کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکیں گے اس لیے انھوں نے ایم اے کے لیے ایسے مضمون یعنی عربی کا انتخاب کیا، جس میں اساتذہ کو ان کی بے توجہی محسوس نہ ہو اور وہ صرف قانون کے امتحان کی تیاری میں مصروف رہیں۔ اب تک وہ لاہور میں گورنمنٹ کالج کے "بورڈنگ ہاؤس" میں رہتے تھے، لیکن مالی تنگ دستی کی وجہ سے اخراجات میں کمی کی خاطر ایک دوست کے شریکِ مکان و طعام ہو کر موری دروازہ میں ایک بالا خانہ میں رہنے لگے۔ اور اس کے بعد اورینٹل کالج کے "بورڈنگ ہاؤس" واقع حضوری باغ (متصل شاہی مسجد و قلعہ) میں منتقل ہوگئے اور وہیں سے قانون کا آخری امتحان دیا[۱۲] انھوں نے یہ امتحان ۱۸۹۹ء میں کامیاب کرلیا اور ۱۹۰۰ء کی ابتدا میں انبالہ میں وکالت شروع کردی[۱۳]۔ یہاں وکالت کرنے میں ایک بڑی مصلحت یہ تھی کہ وہ ان کے آبائی وطن سے قریب اور ضلعی صدر مقام تھا۔ وہاں اس وقت مسلمان وکیل بہت کم تھے، زیادہ تعداد ہندو اور سکھ وکلاء پر مشتمل تھی[۱۴]۔ وہاں

۱۰۔ ولادت: ۱۴/ فروری ۱۸۷۹ء، وفات: ۱۹/ جون ۱۹۴۹ء، پروفیسر شعبۂ فلسفہ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

۱۱۔ "اقبال کے بعض حالات" ص ۲۲۔

۱۲۔ ایضاً۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۵

۱۴۔ شمس الدین پیرزادہ "سید میر غلام بھیک نیرنگ" مقالہ، غیر مطبوعہ۔

میر نیرنگ کی کامیابی کے بڑے امکانات تھے۔ انھوں نے وکالت شروع کر دی اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور اسے قیام پاکستان کے بعد پاکستان منتقل ہونے تک اپنا مستقر بنائے رکھا۔

میر نیرنگ کو ان کی ذہانت اور قانون دانی کے سبب انبالہ میں بہت جلد شہرت اور مقام حاصل ہو گیا۔ انھوں نے ابتدائی چند سالوں ہی میں اپنے سے زیادہ تجربہ کار اور معروف وکیلوں کے مقابلہ میں کئی کامیابیاں حاصل کر لیں، جو ان کی شہرت، حیثیت اور ساتھ ہی ثروت میں اضافہ کا باعث ہوئیں۔ وہ بہت اچھی جرح کرتے تھے[۱۶] اور انبالہ بار کے نہایت ہونہار رکن اور شہر میں بڑا اثر و رسوخ رکھنے والے سمجھے جاتے تھے۔ وہاں کی معاشرتی زندگی میں انھوں نے بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا اور ۱۹۰۱ء میں انبالہ کے میونسپل کمشنر منتخب ہوئے[۱۷]۔ ۱۹۰۹ء تک وہ وکالت کرتے رہے۔ اس عرصہ میں کئی اہم مقدمات کی پیروی اور ان میں کامیابی اور پھر اپنی لیاقت اور قانون دانی سے دوسرے وکلاء کی معاونت کے بارے میں کئی روایات عام ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے چند اصول متعین کر لیے تھے، جن کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ۱۹۰۹ء میں وہ وکالت ترک کر کے سرکاری وکیل کی حیثیت سے "پبلک پراسیکیوٹنگ انسپکٹر" کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء تک اس فریضہ کو انجام دیتے رہے[۱۸] لیکن تحریک ترک موالات کے نتیجہ میں اس عہدہ کو چھوڑ کر دوبارہ وکالت شروع کر دی اور قیام پاکستان تک پنجاب ہائی کورٹ سے منسلک رہے۔

میر نیرنگ کی ایام شباب میں پائے استقلال کی لغزش کا جو ایک مختصر دور آیا تھا اس سے سنبھلنے کے بعد انھوں نے طمانیت قلب کے لیے روحانیت اور تصوف کا سہارا لیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں انھوں نے حضرت سید شاہ ابو احمد محمد علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی[۱۹] کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور روحانیت کی طرف خشوع و خضوع سے رجوع ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کے مرشد نے ان پر خصوصی شفقت اور توجہ کی اور انھیں اپنی خلافت عطا کر کے انھیں بیعت لینے کی اجازت بھی مرحمت کی اور خرقہ و کلاہ بھی عنایت کیے، جنھیں میر نیرنگ نے ساری زندگی متاع عزیز کی طرح حفاظت سے رکھا۔ مرشد نے ان کی باطنی صلاحیتوں سے خوش ہو کر انھیں "لطف اللہ شاہ" کا خطاب بھی دیا۔ میر نیرنگ نے مرشد سے اپنی عقیدت اور انسیت کا اظہار ان کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کو "تحائف اشرفی" کے نام سے جمع کر کے اور ۱۹۰۵ء میں شائع کر کے کیا۔

---

[۱۶] عبدالماجد دریابادی "معاصرین" (کراچی، تاریخ ندارد) ص ۱۹۸

[۱۷] "وکیل" (امرتسر) ۲۹ جولائی ۱۹۰۱ء ـــــ اس ضمن میں اس اخبار نے ایک تہنیتی شذرہ شائع کیا۔

[۱۸] "THE INDIAN YEAR BOOK 1947" ص ۱۱۶۴

[۱۹] ولادت: ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء، وصال: ۱۱ رجب ۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء حالات کے لیے، میر نیرنگ، مقدمہ "تحائف اشرفی"، و نیز محمد دین کلیم قادری "تذکرہ مشائخ قادریہ" (لاہور، ۱۹۷۵ء) ص ۲۴۵ - ۲۴۶

میر نیرنگ اس عرصہ میں اپنے انبالہ کے دوران قیام میں مختلف رفاہی اور فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ انھیں اسلام اور پھر مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی زبوں حالی سے دکھ پہنچتا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی ملی، قومی اور سیاسی بیداری اور اصلاح و ترقی کے لیے بہت خلوص اور جانفشانی کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ انبالہ میں مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے اور پس ماندہ تھے۔ شہر میں مسلمانوں کا کوئی اسکول نہیں تھا، جب کہ ہندوؤں اور سکھوں کے علیٰحدہ علیٰحدہ اسکول موجود تھے۔ میر نیرنگ شہر کے ان رہنماؤں میں تھے جنھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک علیٰحدہ اسکول کے قیام کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ انھوں نے ایک مسلم ہائی اسکول کے قیام کی تدبیریں شروع کر دیں۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمان اکابر کی ایک عام جدوجہد (   ) کہ مسلمانوں کے لیے ہر علاقہ میں ان کی تعلیمی ترقی کے لیے علیٰحدہ تعلیمی ادارے کھولے جائیں۔ سید احمد خاں اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کو مسلمانانِ پنجاب نے فروغ دینے کے لیے جو مؤثر کوششیں کیں، ان کی متعدد جھلکیاں سید احمد خاں کے "سفر نامۂ پنجاب"[20] میں نظر آتی ہیں۔ میر نیرنگ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے "آل انڈیا مسلم (محمڈن) ایجوکیشنل کانفرنس" کی خدمات کو سراہتے اور اس کے کاموں میں خود بھی شریک رہتے تھے۔ کانفرنس میں شامل رہ کر بالخصوص مسلمانانِ پنجاب کی تعلیمی ترقی کے لیے انھوں نے متعدد مواقع پر اپنے پُرخلوص جذبات کا اظہار کیا۔ کانفرنس کے ایک اجلاس منعقدہ دہلی ۱۹۰۲ء میں انھوں نے ایک قرارداد اس مضمون کی پیش کی تھی کہ مسلمانانِ پنجاب کے تعلیمی حقوق کی حفاظت کا کوئی مؤثر ذریعہ سررشتۂ تعلیم کو اختیار کرنا چاہیے[21]۔ اس وقت مسلمانِ پنجاب کی تعلیمی حالت نہایت خستہ تھی، "ورناکیولر اسکول"، جہاں ایک حد تک مسلمانوں کی اجارہ داری رہتی تھی[22]، اور جہاں صدر مدرسوں میں سب ہی مسلمان ہوتے تھے، ۱۹۰۴ء میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ ایک ضلع دہلی میں صرف تین مسلمان صدر مدرس رہ گئے تھے اور پورے پنجاب میں صرف ایک مسلمان صدر مدرس رہ گیا تھا[23]۔

ایک اور موقع پر میر نیرنگ نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ سورت ۱۹۱۸ء میں غلام محمد شملوی کی ایک قرارداد کی تائید کی تھی، جس میں حکومتِ بمبئی سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مقامی

---

[20]۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۳ء

[21]۔ اس قرارداد کی حمایت میں انھوں نے ایک مدلّل تقریر بھی کی، مشمولہ "روداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، منعقدہ دہلی ۱۹۰۲ء" (علی گڑھ، ۱۹۰۳ء) ص ۲۸۷ - ۲۸۹، و نیز قرارداد مشمولہ "پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" (بدایوں، ۱۹۳۷ء) ص ۹۱۔

[22]۔ مولوی نور احمد کا بیان، مشمولہ "رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، منعقدہ لکھنؤ ۱۹۰۴ء" مرتبہ نواب محسن الملک (علی گڑھ، ۱۹۰۴ء) ص ۱۵۲۔

[23]۔ ایضاً۔

مسلمانوں کی درخواست پر سرکاری مدارس میں تعلیمی اوقات کے علاوہ ایک گھنٹہ مذہبی تعلیم کے لیے دینے کی اجازت دے گئی۔[۲۴] میر نیرنگ کو کانفرنس کے جملہ مقاصد سے لگاؤ تھا۔ اور وہ اس کی خدمات کے معترف تھے لیکن پھر بھی انھیں اس سے بعض اصولی اختلافات تھے، اور وہ اس میں کمزوریاں بھی محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے تدارک کے لیے بھی وہ مضطرب رہے۔ اس کے ایک سالانہ اجلاس منعقدہ شیرپور ۱۹۱۹ء میں انھوں نے کانفرنس کے شریک معتمد اعزازی سے اپنی ایک نجی گفت گو میں ان کی طرف نشان دہی بھی کی اور پھر بعد میں "پیسہ اخبار" (لاہور) کی ایک اشاعت میں ایک مراسلہ "بنام آنریری جائنٹ سیکرٹری کانفرنس" شائع کرایا، جس کا عنوان تھا "کیا قوم کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ضرورت ہے یا نہیں"۔ اس مراسلہ میں انھوں نے کانفرنس کے تعلق سے قوم کو اعتماد میں لینے کی درخواست کی تھی اور چند استفسار کیے تھے، جن کے جواب سے قوم کے شبہات دور ہو سکتے تھے اور اصلاح کی بہتر تجاویز مرتب ہو سکتی تھیں۔[۲۵]

میر نیرنگ نے انبالہ میں جس اسکول کے قیام کا منصوبہ تیار کیا تھا، اس کے لیے سرمایہ کی فراہمی ایک بہت بڑا مسئلہ تھی۔ انبالہ کے مسلمان معاشی اعتبار سے بھی بہت خستہ حال تھے۔ لیکن بہر حال میر نیرنگ اور ان کے ایک دوست مرزا اعجاز حسین وکیل انبالہ کی کوششوں اور اثر سے انبالہ میں ایک اسلامیہ اسکول قائم ہو گیا۔[۲۶] ابتدا بالکل معمولی تھی، کھلے میدان میں درس و تدریس کا آغاز ہوا۔ عمارت کی تعمیر اور اسکول کے روزمرہ اخراجات کے لیے مخیر حضرات کے علاوہ گھر گھر سے اور بازاروں میں مختلف صورتوں میں چندہ کی فراہمی شروع ہوئی۔ ایک بڑے احاطہ میں ایک بڑی عمارت اسکول کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعمیر کی گئی۔[۲۷] وقت کے ساتھ ساتھ اس اسکول نے تعلیمی اعتبار سے اور کھیلوں اور بینڈ میں اس قدر ترقی کی کہ نہ صرف پورے ضلع کا بہترین اسکول قرار دیا گیا بلکہ پورے صوبہ میں اس اسکول کا نام شہرت کا حامل ہوا۔[۲۸] اس اسکول کا انتظام "انجمن اسلامیہ انبالہ" کے ذمہ تھا۔ میر نیرنگ اس کے اربابِ اختیار میں تھے اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۲ء تک اس کے صدر رہے۔ اس انجمن نے مسلمانانِ انبالہ کی تعلیمی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے کئی اہم خدمات انجام

۲۴۔ انوار احمد "مرقع کانفرنس" (علی گڑھ، ۱۹۳۵ء) ص ۱۹۸۔

۲۵۔ "پیسہ اخبار" (لاہور)، ۲۶ مارچ ۱۹۲۰ء۔

۲۶۔ شاہ دین ہمایوں "تقریر" مشمولہ "رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، منعقدہ آگرہ ۱۹۱۲ء، ص ۵۰۔

۲۷۔ ۱۹۱۴ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے اسے دیکھ کر اسے مکمل اور اس کی کل حالت کو امید افزا بیان کیا تھا ــــــ "رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، منعقدہ راولپنڈی ۱۹۱۴ء"، ص ۱۶۳۔

۲۸۔ شمس الدین پیرزادہ، مقالہ مذکورہ۔

دیں۔ میر نیرنگ نے نور پور ضلع کانگڑہ میں مسلمانوں کے ایک اسکول کے قیام میں بھی مدد دی تھی[۲۹] وہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس کے لیے وہ علی گڑھ تحریک اور اس کے مقاصد کے تحت دیگر فعال انجمنوں اور اداروں سے وابستہ رہ کر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ وکالت کے آغاز کے ساتھ ہی ان کی قومی سرگرمیوں کا بھی آغاز ہوتا ہے۔ انبالہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد سے وہ قومی اور ملکی اہمیت کے اداروں اور انجمنوں سے وابستہ ہو کر مفید تر خدمات انجام دیتے رہے۔[۳۰] آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ایک عرصہ تک منسلک رہے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مجلسِ منتظمہ اور کورٹ سے اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے بھی بحیثیت رکن ان کا تعلق ایک طویل عرصہ پر محیط ہے[۳۰] بعد میں ۱۹۴۶ء میں میر نیرنگ دہلی یونی ورسٹی کورٹ کے رکن بھی منتخب ہوتے[۳۱] انھوں نے دہلی یونی ورسٹی میں مسلمان اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کے لیے مرکزی مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ کی طرف سے ایک مسودۂ قانون بھی پیش کیا تھا[۳۲] مختلف تعلیمی کانفرنسوں میں بھی انھوں نے شرکت کی اور مختلف مواقع پر تعلیمی ترقی اور اصلاح کے لیے اپنے خیالات اور جذبات مختلف صورتوں میں پیش کیے[۳۳]۔

میر نیرنگ کا عرصۂ ملازمت (۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء) ان کی قومی اور تعلیمی سرگرمیوں کے لحاظ سے ان کے لیے رکاوٹ کا باعث نہ رہا۔ اس عرصہ میں ان کی قومی خدمات کا بڑا حصہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر مرکوز رہا۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور زیادہ آزادی اور مستعدی کے ساتھ قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی نہایت بھرپور اور ولولہ انگیز تحریکِ خلافت کے آغاز کا تھا۔ میر نیرنگ اپنے وقت کی تقریباً تمام اہم قومی تحریکات میں شریک رہے۔ تحریکِ خلافت میں انھوں نے بہت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ شرکت کی۔ تحریکِ خلافت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے جو تحریکِ ترکِ موالات شروع کی گئی تھی، میر نیرنگ دوسرے لاتعداد حساس اور پُرخلوص مسلمانوں کی طرح اپنی ملازمت (پبلک پراسیکیوٹنگ انسپکٹر) سے مستعفی ہو گئے تھے۔ انھوں نے بالخصوص انبالہ میں ان تحریکوں کی کامیابی

۲۹۔ مصطفےٰ علی بریلوی "مسلمانانِ پنجاب کی تعلیم" (کراچی ۱۹۵۰ء)، ص ۳۶۹

۳۰۔ ۱۹۲۶ء میں ندوے کا جلسہ انھوں نے انبالہ میں دھوم دھام سے کرایا۔ عبدالماجد دریا بادی "معاصرین" ص ۱۹۸۔

۳۱۔ محمد یامین خاں "نامۂ اعمال" جلد دوم (لاہور ۱۹۷۱ء) ص ۶۴۳-۱

۳۲۔ ایضاً، ص ۹۰۲۔

۳۳۔ مثلاً دیگر کئی کانفرنسوں کے علاوہ، ۱۹۳۴ء میں منٹگمری (ساہیوال) میں تعلیمی کانفرنس صوبۂ پنجاب کا اجلاس ہوا تھا، جس میں میر نیرنگ نے بھی سر راس مسعود اور نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن شروانی کے ساتھ شرکت کی تھی۔ میر نیرنگ "اقبال کے بعض حالات" ص ۲۵

کے لیے پرجوش اور مؤثر جدوجہد کی۔

تحریکِ خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں کی قوت اور ان کے اتحاد سے خوف زدہ ہو کر ہندوؤں نے، جو مسلمانوں کو ہمیشہ اپنی تہذیب اور اپنے مذہب میں ضم کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں، ۱۹۲۳ء کے آغاز میں اس مقصد کے لیے "شدھی" کی تحریک شروع کی تھی، اس کا زور اور اثر ہندوستان کے بعض علاقوں۔ آگرہ، متھرا، بھرت پور، ایٹہ وغیرہ میں زیادہ تھا۔ مسلمانوں نے اس تحریک کی مدافعت کے لیے ان "شدھی زدہ" علاقوں میں اپنے واعظ اور مبلغ بھیجے تھے۔ میر نیرنگ نے اس زمانہ کے تجربات اور مشاہدات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یکم جولائی ۱۹۲۳ء کو بعض اکابرِ ملت سے، جن میں حاجی مولوی سر رحیم بخش، مولانا عبدالماجد قادری بدایونی، نواب عبدالوہاب خاں وغیرہ شامل تھے، مشورہ و امداد حاصل کر کے ایک "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" قائم کی۔ میر نیرنگ شروع سے اپنی آخری عمر تک اس کے معتمد عمومی رہے [۳۴]۔ اس جمعیۃ کے ذریعہ میر نیرنگ نے دیگر قومی خدمات کے ساتھ ساتھ "تبلیغ کا بھی حق ادا کر دیا [۳۵]۔ اس کے صدر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد طیب اور دیگر ممتاز علماء بھی اس سے وابستہ تھے۔ مولانا مدنی نائب صدر تھے اور مولانا طیب شاخ صوبۂ متحدہ کے صدر تھے [۳۶]۔ اس کا صدر دفتر انبالہ میں تھا۔ اس جمعیۃ نے ہندوستان میں تبلیغِ اسلام اور ارتداد کو روکنے کے کام کو بہت مستعدی، جانفشانی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے اغراض و مقاصد میں 'مسلمانانِ ہند میں ابتدائی مذہبی تعلیم کو ایک وسیع پیمانے پر پھیلانا، ان کی دینی و اخلاقی اصلاح و ترقی کا انتظام کرنا اور حفاظتِ اسلام کی جملہ تدابیر اختیار کرنا، مسلمانانِ ہند کی اقتصادی حالت کی اصلاح کرنا، ہند اور بیرونِ ہند کی غیر مسلم اقوام و افراد کے درمیان تبلیغ و اشاعت اسلام کرنا'، شامل تھا [۳۷]۔ اس جمعیۃ کے تحت ان مقاصد کی تکمیل کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے، متعدد تبلیغی وفود ہندوستان کے طول و عرض میں انسدادِ ارتداد، اشاعتِ اسلام اور مذہبی تعلیم کی ترویج کے لیے سرگرم عمل

---

[۳۴]۔ ایضاً، ص ۲۸-۲۹

[۳۵]۔ عبدالماجد دریابادی "معاصرین" ص ۱۹۸؛ ——"حضرت مولانا محمد الیاس کی جماعت تبلیغی اس کے بہت بعد بنی، نیرنگ صاحب کی جمعیت تبلیغ اس کے علاوہ اور اس سے پیشتر تھی۔" ایضاً۔

[۳۶]۔ میر نیرنگ، مراسلہ مشمولہ روزنامہ "انقلاب" (لاہور)، ۱۹ جنوری ۱۹۲۵ء

[۳۷]۔ میر نیرنگ "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ اسلام کی سترہ سالہ خدمات کا خلاصہ" (انبالہ، ۱۹۴۰ء) ص ۲۱

ہوئے[۳۸] میر نیرنگ نے خود بھی ملک کے متعدد علاقوں کے دورے کیے۔[۳۹] ان دوروں کا مقصد اپنی تحریک تبلیغ کو وسعت دینا، اس کی شاخیں قائم کرنا اور چندہ کی فراہمی وغیرہ تھا۔ وہ اس دوران مختلف اخبارات و جرائد میں ارتداد کی صورت حال، تبلیغ کی ضرورت و اہمیت اور اپنی جمعیۃ کی کارگزاریوں پر مشتمل مضامین اور مراسلے تحریر کرتے رہے۔ جمعیۃ کے تعارف اور اس کی سرگرمیوں کے جائزہ پر مبنی کتابچے بھی انھوں نے تحریر کیے اور ان کی عام اشاعت کی۔

قوم کو میر نیرنگ کی ان خدمات کا احساس رہا اور علماء[۴۰] اور اہل ثروت افراد نے ان کے تبلیغی

---

[۳۸] صرف سترہ سال میں مبلغین نے تقریباً بیس ہزار تبلیغی دورے کیے، سولہ ہزار تبلیغی جلسے منعقد ہوئے، تقریباً ایک سو مجالسِ مناظرہ کا انعقاد ہوا، تقریباً پندرہ ہزار غیر مسلموں کو حلقہ بگوش اسلام کیا گیا، تقریباً دس ہزار مرتدین دوبارہ داخل اسلام ہوئے اور تقریباً پندرہ ہزار بچوں نے چار سال کی ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے جمعیۃ نے ہفت روزہ اخبار "تبلیغ" ۱۹۲۳ء کے آخر میں جاری کیا جو ۱۹۲۵ء کے آخر تک نکلتا رہا۔ اس کے علاوہ ماہانہ رسالہ "اسلام" جو "انجمن تبلیغ الاسلام کانپور" نے جاری کیا تھا اور ہندی میں چھپتا تھا، ۱۹۲۷ء میں انجمن اور جمعیۃ کے مشترکہ سرمایہ سے ہفتہ وار شائع ہونے لگا۔ اس کی ایک اشاعت ہندی میں اور تین اردو میں ہوتی تھیں۔ جمعیۃ نے تقریباً پانچ لاکھ کی تعداد میں تبلیغی کتابچے شائع کیے، کئی تبلیغی کانفرنسیں مختلف شہروں اور ریاستوں میں منعقد ہوئیں، جن میں دہلی کی "آل انڈیا تبلیغ کانفرنس" منعقدہ ۱۵ دسمبر ۱۹۲۷ء لارڈ ہیڈلے فاروق کی صدارت میں بہت بڑے پیمانے پر منعقد ہوئی ——— (میر نیرنگ: "اقبال کے بعض حالات" ص ۴۰) ، ان کاموں کے علاوہ مسلمانوں کی مالی امداد اور ان کے لیے کنوؤں اور مسجدوں کی تعمیر اور مدرسوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر جیسی خدمات بھی اس جمعیۃ سے یادگار ہیں ———
مذکورہ بالا رسالہ ان معلومات کے لیے مفصل ہے۔ و نیز میر نیرنگ کا مکتوب بنام مولوی سید ممتاز علی، مورخہ ۲۸ جون ۱۹۲۶ء مشمولہ "نقوش" (لاہور) "مکاتیب نمبر" جلد اول، نومبر ۱۹۵۷ء ص ۴۰۸ ——— ۴۰۹، اور ان کے علاوہ، میر نیرنگ "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کا چار سالہ کام ایک نگاہ میں" "انقلاب"، ۷ جون ۱۹۲۷ء اور جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی کارگزاریاں، یکم جنوری سے آخر اپریل تک"، "انقلاب" ۵ جون ۱۹۳۱ء

[۳۹] ان دوروں کی تفصیلات اس وقت کے ممتاز اخبارات میں ملتی ہیں، مثلاً "زمیندار" (لاہور) ۱۵ اگست ۱۹۲۳ء؛ "ترجمان سرحد" (راولپنڈی)، ۱۶ جون ۱۹۲۸ء؛ "انقلاب" (لاہور)، ۱۹ اپریل، ۱۶ مئی، ۲۳ مئی، ۲۷ جولائی، یکم نومبر، ۱۴ نومبر ۱۹۳۱ء

[۴۰] ان علما کے علاوہ، جو جمعیۃ کے ساتھ اخلاقی اور عملی تعاون کرتے رہے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے "سچ" (لکھنؤ)، مثلاً ۱۴ مارچ ۱۹۳۰ء کے شمارہ میں، اور مولانا عبدالماجد قادری بدایونی نے "انقلاب" (لاہور) ۱۴ نومبر ۱۹۳۱ء میں، اپنے مضامین میں میر نیرنگ کی تبلیغی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

کاموں کو سراہا[۴۱] میر نیرنگ کا تبلیغی جوش اور ولولہ اس قدر زیادہ تھا کہ اس نے صرف میر نیرنگ کی تشکیل کردہ جمعیتہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ جب تحریک خلافت کے زوال و انحطاط کے زمانہ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے "تنظیم" کے نام سے ایک کل ہند تحریک شروع کی، جس کا مقصد ہندوؤں کی فرقہ ورانہ اور مسلم دشمن تحریکوں کے خلاف مسلمانوں کو منظم کرنا تھا ___ تو میر نیرنگ کا جوش اور جذبہ انھیں اس کے بھی قریب لے آیا۔ میر نیرنگ اس تنظیم میں نہ صرف شامل ہو گئے بلکہ اس کے سب سے سرگرم رکن بن گئے۔[۴۲]

اس عرصہ میں میر نیرنگ دوسرے قومی اور ملی کاموں میں بھی مصروف رہے اور ان کاموں کے سلسلہ میں ان کا رابطہ دوسرے مسلم زعما سے بھی قائم رہا۔ تحریک خلافت کا آخری زمانہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی تحریکوں کی شدت کا ایک انتہائی مرحلہ ہے۔ اس وقت مسلمان تحریک خلافت کے ذریعہ اپنے جوش اور جذبہ کے اظہار کی بہت عمدہ تربیت حاصل کر رہے تھے۔ لیکن ان میں اتحاد و اتفاق کی بہر حال کمی تھی۔ ان کی متعدد انجمنیں اور ادارے مسلمانوں کے لیے مفید خدمات انجام دے رہے تھے، لیکن ہندوؤں کی مسلم دشمن تحریکوں کے مقابلہ میں وہ آپس میں ایک دوسرے کے شریک نہیں تھے۔ چنانچہ ان کی تمام قومی و ملی کوششیں زیادہ بارآور نہیں تھیں۔ میر نیرنگ ان افراد میں تھے جو مسلمانوں اور ان کی تنظیموں کے اس عدم اتحاد اور انتشار کا بہت گہرا احساس رکھتے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر ایک کل جماعتی مسلم کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت کا احساس شدت سے کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۲۵ء کے آس پاس چند کل جماعتی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، لیکن یہ کمی ان سے پوری نہ ہو سکی۔[۴۳] مولانا عبدالماجد بدایونی نے ایسی ایک زیادہ موثر کانفرنس کی تحریک شروع کی اور مولانا حسرت موہانی سے

---

[۴۱] مثلاً "انقلاب" نے ۵ اپریل ۱۹۳۰ء کی اشاعت میں بطور خاص میر نیرنگ کی تبلیغی مساعی کو سراہتے ہوئے اداریہ تحریر کیا اور قوم سے ان کے ساتھ ہر قسم کے تعاون اور خاص طور پر جمعیتہ کی تبلیغی جدوجہد کے لیے ان کی مالی امداد کی ترغیب دی۔ میر نیرنگ نے مسلمانوں سے ۲۵ لاکھ روپے کی درخواست کی تھی اور ان کی فراہمی کے لیے وہ دورے پر نکلے تھے۔ ابتدا زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھی، چنانچہ مولانا دریا بادی نے "سچ" (۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء) میں اور ان کے علاوہ "انقلاب" نے اپنے اداریہ (۲۳ مئی ۱۹۳۰ء) میں بالخصوص مسلمانان پنجاب کو "غیرت ایمانی" اور "حمیت" کے حوالے سے پنجاب کے ہر ضلع سے "اس مبارک کام کے لیے کم از کم دس اور پندرہ ہزار روپے کی اعانت" کرنے کی گزارشیں کی۔ خود میر نیرنگ نے چندہ کے لیے قوم سے کئی درخواستیں کیں، مثلاً "انقلاب" ۵ مارچ ۱۹۳۰ء اور ۳۰ نومبر ۱۹۲۴ء، اور بحوالہ "سچ" ۱۴ مارچ ۱۹۳۰ء؛ اور سرمایہ کی فراہمی کی رفتار کو مختلف اوقات میں قوم کے سامنے پیش کیا، مثلاً "انقلاب" ۲۷ جولائی ۱۹۳۰ء، اور یکم نومبر ۱۹۳۰ء

[۴۲] "اس بدرات کے روح رواں کہنا چاہیئے کہ نیرنگ صاحب ہی تھے"۔ عبدالماجد دریا بادی "معاصرین" ص ۱۹۱۔

[۴۳] میر نیرنگ "مختصر روداد آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ امرتسر ۱۹۲۵ء" (امرتسر ۱۹۲۵ء) ص ۲۔

مشورہ کیا اور اس کے بعد میر نیرنگ کو بدایوں طلب کر کے اس کانفرنس کے انعقاد کی ذمہ داری انھیں سونپ دی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولانا ظفر علی خاں سے بھی مراسلت کے ذریعہ صلاح و مشورہ جاری رہا۔ ڈاکٹر کچلو نے امرتسر میں کانفرنس کے انعقاد کی پیش کش کی جو منظور کر لی گئی چنانچہ بڑے پیمانے پر تیاریوں کے بعد ۱۶ر تا ۱۹ر جولائی ۱۹۲۵ء کو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا، جس میں ۴۳ جماعتوں کے نمائندوں اور ہندوستان کے تقریباً سب ہی علاقوں کے زعما نے شرکت کی [۴۴] میر نیرنگ اس کانفرنس کے سیکرٹری تھے۔ یہ ایک بڑا اعزاز اور مرتبہ تھا جو انھیں اس کانفرنس میں حاصل ہوا۔ اس کانفرنس میں مسلم جماعتوں کے درمیان اشتراک عمل اور کاموں کی تقسیم کے بارے میں متعدد تجاویز پر غور کیا گیا اور مفید فیصلے کیے گئے۔ میر نیرنگ بعد میں منعقد ہونے والی دیگر کل جماعتی کانفرنسوں میں بھی شرکت کرتے رہے [۴۵]

میر نیرنگ اس عرصہ میں خود بھی دیگر مسلم جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرتے ہوئے ان کے قومی اور تبلیغی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ "جمعیۃ اشاعت اسلام" آسام کے سالانہ اجلاس منعقدہ رہاٹ (آسام) ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۹ء میں وہ بحیثیت صدر شریک ہوئے اور ایک مفصل خطبہ پڑھا [۴۶] اور اسی طرح "اشاعت اسلام کانفرنس" منعقدہ میسور ۱۹ر جون ۱۹۳۲ء میں بھی شریک ہو کر انھوں نے ایک مفصل خطبۂ صدارت پیش کیا [۴۷]۔ ۱۹۳۶ء میں اچھوتوں کی ایک کانفرنس نے، جس کے حاضرین کی تعداد دس ہزار بیان کی گئی ہے، ایک قرار داد منظور کی تھی کہ اچھوتوں کو ہندو دھرم چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لینا چاہیئے۔ اس قرار داد کے نتیجہ میں ہندو تنظیموں نے اچھوتوں کو اس فیصلہ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ دوسری جانب مسلمان، عیسائی، سکھ اور دوسرے مذاہب کے پیرو اس کوشش میں مصروف ہو گئے کہ اچھوتوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیں۔ میر نیرنگ اور ان کی جمعیۃ نے بھی انھیں دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے ڈھائی سال تک جد و جہد کی [۴۸] اچھوتوں کی اس قرار داد کی اطلاع مصر میں بھی پہنچی۔ چنانچہ جامعۃ الازہر قاہرہ نے فیصلہ کیا کہ الازہر کے علماء کا ایک وفد اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کا کام کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا جائے۔ الازہر کے شیخ الجامعہ مصطفٰے مراغی نے علامہ اقبال کو خط لکھ کر ان سے مشورہ اور دیگر تفصیلات

---

[۴۴] ان کے ناموں کے لیے: ایضاً ص ۱۸ — ۲۳

[۴۵] مثلاً محمد یامین خاں "نامۂ اعمال" جلد اول (لاہور، ۱۹۷۱) ص ۴۴۴

[۴۶] مطبوعہ، دہلی ۱۹۲۹ء

[۴۷] مطبوعہ، میسور ۱۹۳۲ء

[۴۸] میر نیرنگ "اقبال کے بعض حالات" ص ۱۱

طلب کیں۔ علامہ اقبال نے، جو جمعیۃ مرکزیہ کے ۱۹۲۳ء ہی میں رکن بن گئے تھے [۴۹]، میر نیرنگ سے اس وفد کی رہبری کرنے کی درخواست کی تھی [۵۰]۔ وفد ہندوستان میں دسمبر ۱۹۳۶ء سے جنوری ۱۹۳۷ء تک مختلف شہروں کا دورہ کرتا رہا۔ میر نیرنگ نے اس وفد کو نہ صرف متعدد معلومات فراہم کیں بلکہ تحریری تبصرے اور تجویزیں دیں۔ وفد نے میر نیرنگ کی تجاویز سے اتفاق کیا، لیکن ان پر کسی وجہ سے عمل نہ ہو سکا [۵۱]۔

میر نیرنگ اشاعتِ اسلام اور تبلیغ کے کاموں میں بڑی مستقل مزاجی اور جانفشانی کے ساتھ مصروف رہے۔ وہ عموماً تبلیغی دوروں پر جاتے اور عام مبلغوں کی طرح تبلیغی کام کرتے۔ انھوں نے متعدد افراد کو بھی اپنے ساتھ اس کام میں شامل کر لیا اور مبلغین کی ایک جماعت تشکیل دے دی۔ اس زمانہ میں دیکھنے والوں نے انھیں نورانی صورت اور بڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ ہر وقت تسبیح و تہلیل میں مصروف دیکھا [۵۲]۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی تبلیغی جد وجہد کی وجہ سے انھیں "تبلیغ الدولہ" کا خطاب دیا تھا اور لوگوں نے انھیں "شیخ التبلیغ" کہنا شروع کر دیا تھا [۵۳]۔ ان کے تبلیغی کارناموں پر لوگوں کو بڑا ناز تھا [۵۴]۔

میر نیرنگ کو اسلام اور مسلمانوں کا جو درد تھا اور ان کے لیے انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں جس طرح وقف کر دی تھیں، اس کا اظہار ان کی اور دیگر کاوشوں میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ عشق رسولؐ سے بھی بہت سرشار تھے۔ دو مرتبہ انھوں نے فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ ایک مرتبہ ۱۹۲۹ء میں [۵۵] اور دوسری مرتبہ ۱۹۲۵

---

[۴۹] ایضاً ص ۳۹

[۵۰] ایضاً، ص ۴۱-۴۲

[۵۱] ایضاً، ص ۴۴-۴۵

[۵۲] محمد عبد اللہ قریشی "معاصرینِ اقبال کی نظر میں" (لاہور، ۱۹۷۷ء) ص ۷۵

[۵۳] عبد الماجد دریابادی "معاصرین" ص ۱۹۹

[۵۴] "کہ وہ مسٹر گاندھی کے بڑے لڑکے ہیرا لال گاندھی کو اپنی اور اپنے چند ساتھیوں کی سعیٔ بلیغ سے مشرف بہ اسلام کرنے میں کامیاب ہوئے تھے"۔ صدیق علی خاں "بے تیغ سپاہی" (کراچی، ۱۹۷۱ء) ص ۴۸

[۵۵] روزنامہ "انقلاب" (لاہور) میں ۷ جون ۱۹۲۹ء کو یہ خبر شائع ہوئی:

"حجاز سے میر غلام بھیک نیرنگ معتمد عمومی جمعیۃ مرکزیہ اسلام جو امسال حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے جہاز "اکبر" سے بذریعہ تار اسکی پیغام مطلع کرتے ہیں کہ وہ ۸ جون کو بروز جمعہ کراچی پہنچیں گے، تو گویا ۹ جون تک انشاء اللہ تعالیٰ انبالہ شہر پہنچیں گے۔"

—— "۱۹۲۹ء میں جب میں حج کو حاضر ہوا تو ان سے مدینہ منورہ میں خوب پر لطف صحبتیں رہیں اور کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ واپسی میں جہاز پر بھی ساتھ رہا"۔ عبد الماجد دریابادی "معاصرین" ص ۱۹۸

میں۔ پہلے حج کے لیے وہ ۱۴ر جنوری کو بمبئی ایکسپریس سے روانہ ہوئے جہاں سے انھیں ۱۷ر تاریخ کو جہاز "خسرو" سے روانہ ہونا تھا۔[56] بمبئی میں میر نیرنگ نے حج کمیٹی کے روبرو جس کے صدر ایچ۔ بی۔ کلیٹن تھے، حجاج کی سہولتوں، آرام اور اخراجات میں رعایتوں کے لیے اپنی تجاویز پیش کیں[57] حج کمیٹی کے سامنے جتنی شہادتیں گذریں اور جتنے بیانات پیش ہوئے، "ان میں شاید سب سے زیادہ مفصل، جامع، باوزن شہادت میر نیرنگ کی تھی"۔[58] حج سے واپس آکر انھوں نے مولانا عبدالماجد دریا بادی کے مجلّہ "سچ" (لکھنؤ) میں "مدینہ طیبہ اور عین زرقا" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں مدینہ طیبہ تک پانی پہنچانے والی نہر "عین زرقا" کی خستہ حالی کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانان ہند سے درخواست کی کہ اس نہر کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے چندہ بھیجیں[59]

دوسری مرتبہ کے حج میں انھوں نے مدینہ طیبہ میں مسجد نبوی کی حالت کو دیکھ کر، جو روز بروز خستہ ہوتی جا رہی تھی، شدید قلق محسوس کیا۔ وہ وہاں کے حالات سے اس حد تک مضطرب ہوئے کہ انھوں نے ان حالات کی اصلاح کی تدابیر بھی اختیار کرنے کی اپنی بساط بھر کوشش کی، واپسی پر سب سے پہلے انھوں نے اخبارات کے ذریعہ سے مختصر طور پر ایک بیان شائع کیا، جس میں انھوں نے کہا کہ مسجد نبوی کی حالت روز بروز خستہ ہوتی جا رہی ہے اور سعودی حکومت، جو دنیائے اسلام کی جانب سے اس عظیم اور مقدس بارگاہ کی محافظ و منتظم ہے، اپنے فرائض سے بے پروا نظر آتی ہے اور اس نے مسجد کے اندر نام پاک رسولؐ کے خوبصورت کتبات کو بھی مٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس افسوس ناک صورت حال کے پیش نظر ہندستانی حاجیوں نے "خادمان حرمین" کے نام سے ایک انجمن قائم کی ہے جو حکومت کو کتبات کی بحالی پر مجبور کرے گی اور مسجد کی خدمت کرے گی۔ اس سلسلہ میں سلطان ابن سعود سے جو بھی خط و کتابت ہوئی وہ عنقریب شائع کر دی جائے گی۔[60]

میر نیرنگ اس مجلس کے صدر تھے۔ انھوں نے مسجد نبوی کی اہمیت اور اس کی خستہ حالی کی مفصل

---

[56] روزنامہ "سیاست" (لاہور)، ۲۰ر جنوری ۱۹۲۹ء، اس جگہ ان کی روانگی کے تفصیلی واقعات درج ہیں۔

[57] روزنامہ "انقلاب" (لاہور) ۱۱ر اگست ۱۹۲۹ء، نیز انھوں نے ایک اور بیان انگریزی میں قلمبند کر کے حج کمیٹی کے پاس روانہ کیا، اس کا ترجمہ "سچ" (لکھنؤ)، ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

[58] عبدالماجد دریا بادی "فتنہ کامران"، "سچ" (لکھنؤ)، ۱۳ر ستمبر ۱۹۲۹ء، ص ۲

[59] "سچ" (لکھنؤ)، ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۸

[60] میر نیرنگ "مجلس خادمان حرمین" (انبالہ، ۱۹۳۰ء)، ص ۱۲

کیفیت اور "مجلس خادمان حرمین" کی تشکیل اور اغراض و مقاصد پر مشتمل ایک کتابچہ "مجلس خادمان حرمین" رسالہ[۶۱] بھی تحریر کیا۔ یہ مجلس حج سے واپسی پر ۲۸ جنوری ۱۹۴۵ء کو جہاز "اکبر" کے سفر کے دوران تشکیل پائی۔ اس کی شاخیں ہندوستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مقصد کے لیے ایک عارضی کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کے معتمد بٹالہ ضلع گورداس پور کے مولانا چوہدری فتح محمد تھے۔ اس مجلس کے لیے جو اصول طے کیے گئے ان میں اس کا مقصد حرمین کی حرمت اور عظمت کا تحفظ اور اسلامی روایات کے مطابق حرمین اور اہل حرمین کی خدمت کرنا شامل تھا[۶۲]۔ اس مجلس کے ارکان تقریباً تمام صوبوں سے نامزد ہوئے[۶۳]۔ تشکیل کے فوراً بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ساحل ہندوستان پر پہنچتے ہی سلطان ابن سعود کی خدمت میں ایک احتجاجی تار بھیجا جائے۔ چنانچہ میریٹرنگ نے ۳۰ جنوری کو کراچی سے سلطان ابن سعود کی خدمت میں مکہ مکرمہ ایک تار بھیجا، لیکن سلطان کی جانب سے اس کا جو جواب آیا وہ کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا[۶۴]۔ میریٹرنگ نے اخبارات کے ذریعہ صورت حال عوام کے سامنے پیش کی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علماء سے اس باب میں تبادلۂ خیال کیا۔ یہ درخواست بھی کی کہ ہر صوبہ اور ہر ریاست میں مجلس کی شاخیں قائم کی جائیں۔ اس مقصد کے تحت میریٹرنگ نے اپنے تحریر کردہ رسالہ "مجلس خادمانِ حرمین" کو وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں تقسیم کیا۔

تعلیمی، تبلیغی اور مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ میریٹرنگ کی وہ خدمات بھی نہایت موثر اور ممتاز ہیں جو انھوں نے صرف اپنا لہ ہی نہیں، مسلمانانِ ہند کی معاشی اور معاشرتی حالت کو بہتر بنانے کے لیے انجام دیں۔ اشاعت اور تحفظِ اسلام کے علاوہ ان کی وہ خدمات جو تحفظ مسلمانانِ ہند کے لیے مختلف مواقع پر سامنے آئیں، اسلام اور مسلمانوں کے باب میں ان کے درد اور خلوص کو نمایاں کرتی ہیں خصوصاً ریاست الور کے مسلمانوں کو وہاں کے حکمرانوں کے ظلم و ستم سے بچانے اور انھیں اخلاقی اور مادی امداد فراہم کرنے میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ریاست الور کی حکومت عرصہ دراز سے اپنی مسلمان رعایا کو مٹانے کی فکر میں تھی۔ اس نے ایسی کوششیں شروع کر رکھی تھیں کہ مسلمان ہندوؤں کی تہذیب

---

[۶۱] مطبوعہ، ۱۹۴۵ء

[۶۲] ایضاً، ص ۸

[۶۳] ان کی فہرست کے لیے ایضاً، ص ۹ - ۱۰

[۶۴] عبارتوں کے لیے: ایضاً ص ۱۰ — ۱۱

میں ضم ہو جائیں اور اپنے مذہب کو چھوڑ دیں۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ مسلمانوں کے مدارس، مذہبی تعلیم اور اردو زبان کی ترویج وغیرہ بند ہو جائے۔ اس کے علاوہ مساجد کا انہدام، انھیں مندر بنانا، قبرستانوں کو ہموار کر کے وہاں تنصیبات قائم کرنا وہاں کا ایک معمول بن گیا تھا۔ اگر مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے آئینی جدوجہد کرتے تو ان کو باغی اور ریاست کے مخالف اور ان کی قائم کردہ انجمنوں کو خلاف قانون قرار دیا جاتا۔ مسلمان آئے دن کی زیادتیوں سے تنگ آ کر احتجاج کرنے پر مجبور ہوتے تو ان پر مظالم کیے جاتے۔ ایک ایسے ہی موقع پر ۲۹ مئی ۱۹۳۲ء کو ریاست کی فوج نے بلاوجہ اور بالکل ناجائز طور پر مسلمانوں کے پرامن اور نہتے مجمع پر گولی چلا دی۔ کئی مسلمان شہید ہو گئے اور کئی زخمی ہوئے۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں پر گوناگوں تشدد کیا گیا جس کے نتیجہ میں تنگ آ کر مسلمان الور سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ دہلی پہنچے اور جامع مسجد کے قریب پناہ گزیں ہوئے [۶۵]۔ میر نیرنگ پہلے ہی سے مسلمانانِ الور کی افتاد اور پریشانیوں سے آگاہ تھے اور ان کی جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام اس مسئلہ کے لیے فکر مند بھی تھی اور میر نیرنگ نے بھی اس کے معتمد کی حیثیت سے معاملاتِ الور کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا [۶۶]۔ وہ اس وقت "آل انڈیا مسلم کانفرنس" کے بھی معتمد تھے، انھوں نے کانفرنس سے بھی معاونت حاصل کر لی یہ فیصلہ ہوا کہ مسلمانانِ الور کی دادرسی کے لیے وائسرائے کو متوجہ کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک وفد تشکیل دیا گیا جو شملہ جا کر وائسرائے کی خدمت میں مسلمانانِ الور کے مسائل پیش کرتا۔ علامہ اقبال کانفرنس کے صدر تھے۔ وہ اور میر نیرنگ بحیثیت صدر اور معتمد عمومی اس وفد کی قیادت کرتے ہوئے شملہ پہنچے اور ۲ اکتوبر کو وائسرائے سے ملاقات کی [۶۷]۔ وفد کی اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ وائسرائے نے مسلمانانِ الور کے تمام مطالبات پر ہمدردی سے غور کرنے کے بعد الور کے راجہ کو معزول کر دیا اور اس کی جگہ ریاست کا انتظام ایک انگریز منتظم کے سپرد کر دیا۔ مسلمانانِ الور مطمئن ہو کر واپس الور چلے گئے۔ ان کی مہاجرت کے زمانہ میں میر نیرنگ اور ان کی جمعیۃ نے ہر طرح ان کی خاطر داشت کی اور ان کے قیام اور طعام کا مکمل انتظام کیا۔ میر نیرنگ نے رائے عامہ کو مسلمانانِ الور کی حالت زار اور حکومت کے مظالم سے واقف کرانے کے لیے متعدد ذرائع اختیار کیے۔ سارے ہندوستان میں "یوم الور" (جمعہ، ۲۲ جولائی ۱۹۳۲ کو) منانے

---

[۶۵] "تقریباً دس ہزار مسلمانوں نے ہجرت کی"۔ میر نیرنگ بنام حکیم محمد اسحاق حقانی، مورخہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء مشمولہ "نقوش" (لاہور) مکاتیب نمبر، جلد اول ص ۱۱۴ - ۱۱۳

[۶۶] میر نیرنگ "اقبال کے بعض حالات" ص ۴۴

[۶۷] ایضاً۔

کا اہتمام کیا[۵۹]۔ اخبارات میں کوائف شائع کیے، ارباب اختیار سے ملاقاتیں کیں اور مسلمانانِ الور کے حالات اور ان کے مطالبات پر مشتمل ایک کتاب اردو اور انگریزی میں مرتب کر کے شائع کی[۶۰]۔ میر نیرنگ بعد میں بھی مسلمانانِ الور کے حامی رہے اور مسلمانانِ الور بھی میر نیرنگ کی مخلصانہ جدوجہد کے معترف تھے اور انھیں اپنا محسن سمجھتے تھے[۶۱]۔

ایک اور واقعہ جو جامع مسجد جے پور کے تعلق سے پیش آیا، میر نیرنگ کی مستقل توجہ اور بھرپور جدوجہد کا سبب بنا۔ مسجد کے ایک دروازے اور سیڑھیوں کی تعمیر کے مسئلہ پر ۲۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو جمعہ کے دن نماز جمعہ کے موقع پر مسلمانوں کو ہندوؤں اور پولیس کے بہیمانہ حملہ کا شکار ہونا پڑا۔ کئی مسلمان شہید اور زخمی ہوئے اور کئی گرفتار کر لیے گئے۔ مسلمانوں نے اس سانحہ پر شدید غم و غصہ کا اظہار کیا اور احتجاج شروع کیا۔ پانچ ہزار سے زائد مسلمان جے پور سے ہجرت کر کے دہلی چلے گئے[۶۲]۔ جے پور کے راجہ کا رویہ خون ریزی کا سبب بنا تھا اور اس میں مزید اضافہ کا امکان تھا۔ مسلمانوں نے غیر جانبدارانہ تحقیقات کا مطالبہ کیا جسے مسترد کر دیا گیا[۶۳]۔ میر نیرنگ نے اس مسئلہ کو بھی مسلمانوں کا قومی مسئلہ سمجھتے ہوئے اس پر خاص توجہ دی۔ وہاں

---

۵۹ اور اس کا ایک موثر نظام العمل ترتیب دیا۔ تفصیلات کے لیے: روزنامہ "انقلاب" (لاہور)، ۴ر جولائی ۱۹۳۲ء، ص ۴

۶۰ مطبوعہ، ۱۹۳۲ء

۶۱ جب میر نیرنگ نے رحلت پائی تو "انجمن مہاجرین الور" نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو اپنے ایک جلسہ منعقدہ حیدرآباد، بصدارت چوہدری عبدالرحمٰن میں یہ قرارداد منظور کی۔

"یہ جلسہ حضرت الحاج میر غلام بھیک صاحب نیرنگ (رکن پاکستان دستور یہ) کے انتقال پر ملال پر تہ دل سے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ رب العزت مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں مقام بلند عطا فرمائے اور مرحوم کے پس ماندگان کو توفیق صبر بخشے۔ مرحوم ۱۹۳۲ء سے تا دم آخر مسلمانانِ ریاست الور کے حامی رہے۔ یہ جلسہ آپ کی رحلت کو قوم کے لیے نقصان عظیم خیال کرتا ہے۔" قرارداد، محرکہ بیگم ڈاکٹر ظفر الحسن

اختر الوری، معتمد عمومی "انجمن مہاجرین الور" نے اس سانحہ رحلت پر دو مرثیوں میں میر نیرنگ سے اپنی ارادت و عقیدت کا اظہار کیا۔

۶۲ میر نیرنگ، پریس ٹیلیگرام، مورخہ ۹ر مئی ۱۹۲۹ء، "QAID-E-AZAM PAPERS" (قائداعظم پیپرز) مخزونہ، ڈپارٹمنٹ آف آرکائیوز، اسلام آباد، الیف۔ ۶۹۷، ص ۸۲

۶۳ میر نیرنگ بنام قائداعظم، مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۲۹ء، "قائداعظم پیپرز" الیف۔ ۶۹۷، ص ۱۵ ۔ ۱۶

کے مسلمان اکابر سے ان کا مستقل رابطہ رہا۔ انھوں نے میرنیرنگ سے اس مسئلہ پر متعدد مواقع پر مدد اور مشورے طلب کی [۵۳]۔ میرنیرنگ نے کئی مرتبہ جے پور کے دورے کیے اور وہاں کے اعلیٰ افسران اور ریاست کے ارباب اختیار سے ملاقاتیں کیں [۵۴] اور مراسلت بھی کی [۵۵]۔ اس مسئلہ کو مسلم لیگ اور قائداعظم نے بھی خاص اہمیت دی تھی۔ میرنیرنگ ــ قائداعظم اور جے پور کے مسلمانوں اور ریاست کے حکمرانوں کے درمیان ایک واسطہ بنے رہے۔ قائداعظم نے جے پور کے مسلمانوں کے اس مسئلہ کے حل کے اختیارات میرنیرنگ کو تفویض کر دیے تھے [۵۶]۔ اس وقت میرنیرنگ نے جے پور کے مسلمانوں کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا ریاست نے بہرحال مسلمانوں کے متعدد مطالبات تسلیم کر لیے اور یہ مسئلہ بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا۔

میرنیرنگ کو قوم کا درد سیاست کے کارزار سے بھی دور نہ رکھ سکا۔ اپنے وقت کی ہر اہم اور بڑی قومی تحریک میں وہ شامل رہے اور اپنی عملی، تنظیمی اور ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے۔ قومی زندگی کو ان کے ذہن اور قلم نے ہر موقع پر فائدہ پہنچایا۔ اکابر ملت اور سیاسی قائدین سے ان کا قریبی رابطہ رہا۔ عملی سیاست میں وہ ایک سرگرم اور مستعد سیاسی رہنما کا بے لوث کردار ادا کرتے رہے۔ صحافت کے میدان میں ان کی صلاحیتیں وقت کے ہر اہم قومی اور سیاسی مسئلہ پر قومی تعمیر اور قوم کی رہبری کے کام آتی رہیں۔ مرکزی مجلس دستور ساز میں وہ ٹھوس اور مفید آئینی اصلاحات کے لیے سرگرم عمل رہے اور ان کی نکتہ رسی، جرأت اور قومی ہمدردی قوم کے لیے آئینی و سیاسی حقوق کے حصول میں کام آتی رہی۔ ان کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت میں شمولیت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے انبالہ میں رہ کر تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی کامیابی کے لیے نہایت مستعدی اور سرگرمی دکھائی۔ اس دوران اُن کی حق گوئی اور بے باکی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہوا۔ تحریک ترکِ موالات کے سلسلہ میں مسٹر گاندھی ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے انبالہ بھی پہنچے تھے۔ انھوں نے وہاں ایک جلسہ سے خطاب کیا، جس میں میرنیرنگ بھی

۵۳۔ میرنیرنگ بنام قائداعظم، مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۳۹ء "قائداعظم پیپرز" ایف۔ ۱۱۵، ص ۹

۵۴۔ میرنیرنگ بنام قائداعظم، مورخہ ۱۵ر اپریل ۱۹۳۹ء "قائداعظم پیپرز" ایف ـ ۹۷، ص ۹۸ ـ ۹۹؛ خود ریاست کے حکمرانوں نے بھی میرنیرنگ کو اس مسئلہ کے حل کے لیے جے پور آنے کی دعوت دی' میرنیرنگ بنام قائداعظم مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۳۹ء "قائداعظم پیپرز" ایف۔ ۱۱۵، ص ۸

۵۵۔ مثلاً میرنیرنگ کا ایک مفصل مکتوب بنام ایف۔ ایس۔ ینگ، انسپکٹر جنرل پولیس ریاست جے پور، مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۳۹ء "قائداعظم پیپرز" ایف ۱۱۵، ص ۴ ـ ۷

۵۶۔ میرنیرنگ بنام قائداعظم، مورخہ ۱۸ر جون ۱۹۳۹ء "قائداعظم پیپرز" ایف ـ ۹۷، ص ۲۲

شریک تھے۔ مسٹر گاندھی نے اپنی تقریر میں اپنے مخصوص خیالات کے مطابق سوراج کے حق میں تقریر کی تھی لیکن ان کے بعد میر نیرنگ نے بحیثیت صدر جلسہ تقریر کی جس میں برطانیہ کے زیر سایہ "رام راج" کے قیام کو ہرگز قبول نہ کرنے کا عزم بیان کیا۔ چنانچہ جلسہ میں مسٹر گاندھی کے منشا کے مطابق قرار داد منظور نہ ہو سکی۔ مسٹر گاندھی نے جلسہ کے بعد میر نیرنگ کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن میر نیرنگ نے مروت کو بالائے طاق رکھ کر پھر یہی کہا کہ "مسلمانوں کی حق رسی لازمی ہے۔ "رام راج" سے مسلمانوں کو انصاف کی توقع نہیں، اس لیے میں آپ کی تجویز کے خلاف ہوں"۔ [۷] لیکن میر نیرنگ نے ترک موالات کی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا، یہاں تک کہ بعد میں بھی اس فیصلہ پر قائم رہے اور کھدر زیب تن کیا۔ [۸]

ابتدا میں میر نیرنگ نے "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کی تحریکوں میں نہایت خلوص کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ کچھ عرصہ انبالہ کانگریس کمیٹی کے صدر بھی رہے [۹] لیکن وہ ہندوؤں کے رویہ کو دیکھتے ہوئے بہت جلد اس سے دل برداشتہ ہو گئے۔ "شدھی" اور "سنگھٹن" کے زمانہ میں ان کی یہ دل برداشتگی اس حد تک بڑھی کہ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے خیال کو خیر باد کہہ کر نہ صرف خود کو کانگریس سے دور رکھا بلکہ اپنی تحریک تبلیغ کے توسط سے دراصل کانگریس اور دیگر مسلم دشمن جماعتوں اور تحریکوں کے خلاف جدوجہد کرتے رہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوسی میں انھیں بعض قریبی دوستوں کی ناراضگی بھی برداشت کرنی پڑی۔ مولانا محمد علی جوہر میر نیرنگ کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ لیکن جب میر نیرنگ نے تحریک تبلیغ شروع کی تو ہندو مسلم اتحاد میں اس کے سبب مزید خلیج پیدا ہونے کے خیال سے انھوں نے میر نیرنگ کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر میر نیرنگ اپنے خیال سے باز نہ آئے۔ مولانا محمد علی نے جوش میں آکر "ہمدرد" میں میر نیرنگ اور تحریک تبلیغ کے خلاف دو مضامین لکھ ڈالے، لیکن میر نیرنگ نے پھر بھی اپنا رویہ تبدیل نہ کیا۔ مولانا محمد علی کی ناراضگی کچھ مدت کے بعد ختم ہو گئی کیونکہ مولانا محمد علی خود بھی ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے مایوس ہو گئے تھے۔

ایک اور موقع پر بھی میر نیرنگ اور مولانا محمد علی میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔ ۱۹۲۷ء میں راج پال نے ایک کتاب آنحضورؐ کی سیرت پر رکیک اور غلط الزامات کے ساتھ شائع کی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت اور اس میں لگائے جانے والے الزامات پر ہندوستان بھر کے مسلمان شدید طور پر مشتعل ہوئے۔ انھوں نے جلسے کیے، جلوس نکالے، قانون شکنی کی اور توہین عدالت کی۔ حکومت نے مسلمانوں کے احتجاج کے نتیجہ میں راج پال کو گرفتار

---

[۷] شمس الدین پیرزادہ، مقالۂ مذکور،

[۸] ایضاً۔

[۹] ایضاً۔

کر لیا۔ لیکن جسٹس دلیپ سنگھ نے اسے بری کر دیا۔ مسلمانوں کے احتجاج کا رخ جسٹس دلیپ سنگھ کی طرف پھر گیا اور انھوں نے اس کے استعفیٰ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میر نیرنگ بھی ان پرجوش مسلمانوں میں شامل تھے جو دلیپ سنگھ کے مستعفی ہونے کے حق میں تھے، لیکن مولانا محمد علی دلیپ سنگھ کو بے قصور سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اصل قصور اس قانون کا تھا جس نے دلیپ سنگھ سے یہ فیصلہ کرایا تھا۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں کے جذبات کو سرد کرنے کے لئے تقاریر کیں اور مضامین لکھے اور اس قانون میں ترمیم کے لئے ایک مسودہ بھی تیار کر لیا۔ میر نیرنگ نے ایک تند و تیز خط لکھ کر ان کی روش پر نکتہ چینی کی سنہ ۸۰۔ اس کے باوجود وہ مولانا محمد علی سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے انتقال پر انھوں نے کہا تھا کہ "قوم بیوہ ہو گئی" [۸۱]

میر نیرنگ نے پنڈت دھرم بھکشو کی کتاب "کلام الرحمن" کی اشاعت پر بھی سخت احتجاج کیا تھا، جس میں اسلام اور آنحضور ؐ کی زندگی پر رکیک الزامات لگائے گئے تھے۔ انھوں نے تمام مسلمانوں کو اس کتاب کے خلاف نفرت اور غصہ کا اظہار کرنے کے لئے ایک اخباری بیان جاری کیا۔ اس میں حکومت پر بھی زور دیا کہ وہ اس کتاب کے مصنف، طابع اور ناشر کو گرفتار کرے۔ [۸۲]

میر نیرنگ وقتاً فوقتاً ان آئینی مسائل پر بھی توجہ دیتے رہے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کے لئے کسی نہ کسی طرح اہمیت رکھتے تھے۔ جب ۱۹۲۹ء میں "شارداایکٹ" منظور ہوا جس کا مقصد ہندوؤں میں کم سنی کی شادی کو روکنا تھا، لیکن یہ قانون تمام ہندوستانیوں بشمول مسلمانوں پر بھی عائد کر دیا گیا تو میر نیرنگ ان اکابر میں تھے جو اس قانون کے خلاف تھے کیونکہ مسلمانوں کو اس قسم کی پابندیوں کی ضرورت نہیں تھی اور دوسرے یہ رسم مسلمانوں میں عام بھی نہیں تھی۔ چنانچہ مولانا محمد علی اور دیگر قائدین نے اس قانون کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ میر نیرنگ نے بھی اس پر نہ صرف احتجاج کیا بلکہ عام مسلمانوں کو بھی احتجاج کرنے پر راغب کیا اور اس ضمن میں اخبارات میں اپنی گزارشات شائع کروائیں [۸۳] اور اس کے خلاف جمعہ، ۱۷ر جنوری ۱۹۳۰ء کو متفقہ طور پر "یوم احتجاج" منانے کی تلقین کی [۸۴]
اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے راجہ رگھو تندر پرشاد کے مجوزہ مسودۂ قانون کے خلاف، جو مجلس دستور ساز میں

۸۰؎ رئیس احمد جعفری "سیرت محمد علی" (لاہور، ۱۹۵۰ء) ص ۴۴۴، میر نیرنگ اور مولانا محمد علی کی اس باب میں مراسلت کے لئے: ایضاً، ص ۴۴۴ — ۴۸۶

۸۱؎ میر نیرنگ بنام مولانا عبد الماجد دریا بادی، مطبوعہ "سچ" (لکھنؤ) ۲۷ر فروری ۱۹۳۱ء ص ۳

۸۲؎ روزنامہ "انقلاب" (لاہور) ۱۵ر جنوری ۱۹۳۰ء

۸۳؎ "اب مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے" روزنامہ "انقلاب" (لاہور) ۱۱ر اکتوبر ۱۹۲۹ء ص ۲

۸۴؎ روزنامہ "انقلاب" (لاہور) ۱۵ر جنوری ۱۹۳۰ء

گاؤکشی کو قانوناً بند کرانے کے لئے پیش کیا جا رہا تھا، احتجاج کرنے اور "شاردا بل" کے ساتھ ساتھ "یوم احتجاج" میں اس پر بھی احتجاج کرنے کی درخواست کی [۸۵] بعد میں ایک اور موقع پر ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو کم سنی کی شادی کے مسئلہ پر ایک اور مسودۂ قانون مجلس دستور ساز میں پیش ہوا تو میر نیرنگ نے شریعت اسلامی کے حوالہ سے اس کی بھی سخت مخالفت کی [۸۶]

کانگریس سے کنارہ کشی کے بعد میر نیرنگ نے کسی اور سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار نہیں کی، صرف اپنے تبلیغی کاموں میں مصروف رہے۔ لیکن ان کی یہ عدم وابستگی زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکی۔ علامہ اقبال اور دیگر احباب کے اصرار پر وہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے [۸۷] اور پھر احباب ہی کے اصرار پر لیگ کے تحت عام انتخابات میں حصہ لے کر مرکزی مجلس دستور ساز کا رکن بننا بھی قبول کر لیا۔ میر نیرنگ کو لیگ کے مقاصد اور اس کی تحریک سے ہمیشہ وابستگی رہی۔ وہ اس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد ہی اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے کراچی کے سالانہ اجلاس کے بعد میاں محمد شفیع اور سر فضل حسین نے لیگ کی صوبائی شاخ پنجاب میں قائم کرنے کی تیاریاں کیں تو میر نیرنگ سر فضل حسین کے اس حامی گروہ کے ساتھ رہے جو "ترقی پسند" سمجھا جاتا تھا اور جس میں علامہ اقبال، ملک برکت علی، بیرسٹر تاج الدین، چوہدری شہاب الدین، خلیفہ شجاع الدین وغیرہ شامل تھے [۸۸] وہ اس کے بعد بھی لیگ کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا، جس کا اہتمام سر فضل حسین نے کیا تھا۔ میر نیرنگ کو بھی اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور سر فضل حسین نے انھیں اپنے ہی گھر میں ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا [۸۹] میر نیرنگ نے اس اجلاس میں شرکت کی اور وہ ایک مجلس کے رکن بھی نامزد ہوئے، جس کا مقصد مرکزی مجلس خلافت کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی عام جدوجہد کے لئے ایک

---

[۸۵] ایضاً۔

[۸۶] "LEGISLATIVE ASSEMBLY DEBATES" (دہلی، ۱۹۲۸ء) ۳ فروری ۱۹۲۸ء ص ۲۹۴–۲۹۷ و نیز ایضاً ۱۶ فروری ۱۹۲۸ء ص ۷۲۳، ۷۲۵–۷۲۶

[۸۷] شمس الدین پیرزادہ، مقالۂ مذکور۔

[۸۸] عظیم حسین: "FAZL-I-HUSAIN, A POLITICAL BIOGRAPHY" (بمبئی، ۱۹۴۶ء) ص ۹۷؛ شیخ محمد اکرام: "MODERN MUSLIM INDIA AND THE BIRTH OF PAKISTAN" (لاہور، ۱۹۷۷ء) ص ۲۲۵–۲۲۶، ۲۷

[۸۹] فضل حسین بنام حبیب اللہ، مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۲۴ء "LETTERS OF MIAN FAZL-I-HUSAIN." مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (لاہور، ۱۹۷۶ء) ص ۹۱۷–۹۱۸

منصوبہ کا خاکہ بنانا تھا[۹۰]۔ میر نیرنگ نے لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی، دسمبر ۱۹۲۶ء میں بھی شرکت کی تھی۔ اس اجلاس میں انھیں لیگ کی صوبائی مجلس برائے پنجاب کا رکن نامزد کیا گیا تھا جس کا کام مستقبل کی اصلاحات کے لئے ایک منصوبہ تیار کرنا اور لیگ کی مرکزی مجلس کو پیش کرنا تھا[۹۱]۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی پہلی کل ہند مسلم کانفرنس میں میر نیرنگ نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے شرکت کی تھی[۹۲]۔ میر نیرنگ اس کل ہند مسلم کانفرنس کی ایک مجلس انتظامی کے رکن بھی نامزد ہوئے تھے، جس کا مقصد "کمیونل ایوارڈ" پر غور کرنا تھا۔ اس مجلس کے صدر علامہ اقبال تھے[۹۳]۔

میر نیرنگ نے لیگ سے مستقل وابستہ ہونے کے بعد انبالہ کے مسلمانوں میں آزادی اور قومی شعور پیدا کرنے میں مؤثر حصہ لیا۔ ان کی کوششوں کے اثر سے انبالہ میں لیگ کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور مسلمانوں میں قومی تحریکوں میں حصہ لینے اور سیاسی آزادی کے حصول کے جذبات عام ہوئے۔ چونکہ میر نیرنگ کو اپنے شہر میں بڑی عزت اور وقار حاصل تھا، اس لیے وہ انبالہ ضلع سے ۱۹۲۴ء کے انتخابات میں بلا مقابلہ منتخب ہو گئے اور اس کے بعد ہر انتخاب میں منتخب ہوتے رہے۔ انھوں نے اپنی صلاحیت اور لیاقت سے نہ صرف صوبائی لیگ کو بلکہ اس کی مرکزی تنظیم کو بہت فائدہ پہنچایا[۹۴]، چنانچہ بہت جلد لیگ کے ممتاز قائدین میں شمار ہونے لگے۔ ان کی "اچھی طرح جرح کرنے" والی صلاحیتیں انھیں بہت جلد ممتاز کرنے کا سبب بنیں۔ انھیں عملی میدان میں اپنی تنظیمی صلاحیتوں کی تربیت کے بہت اچھے مواقع ملے تھے ــــــ ان کی یہ سب خصوصیات اب لیگ اور مسلمانوں کی آئینی اور سیاسی جدوجہد میں کام آ رہی تھیں[۹۵]۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک وہ مرکزی مجلس دستور ساز میں لیگ کے "ڈپٹی لیڈر" کی حیثیت سے لیگ اور اس طرح مسلمانوں کی قیادت کرتے رہے۔ اس عرصہ میں قائداعظم لیگ اسمبلی پارٹی کے "لیڈر" تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی بے پناہ ذمہ داریوں کے باعث بہت کم اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہو سکتے تھے اس لیے ان کی عدم موجودگی میں میر نیرنگ ہی لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر کے فرائض

---

[۹۰] شریف الدین پیرزادہ "FOUNDATIONS OF PAKISTAN" جلد اول (کراچی، ۱۹۶۹ء) ص ۵۸۰

[۹۱] ایضاً جلد دوم (کراچی، ۱۹۷۰ء) ص ۱۰۲ ـ ۱۰۳

[۹۲] کے۔ کے۔ عزیز "THE ALL INDIA MUSLIM CONFRENCE" (کراچی ۱۹۷۲ء) ص ۳۲

[۹۳] ایضاً، ص ۳۰۳ ـ ۳۰۴

[۹۴] "وہ اسمبلی میں بڑی نپی تلی تقریریں کرتے تھے" ــــــ صدیق علی خاں 'بے تیغ سپاہی' ص ۱۸

[۹۵] اس کی کچھ مثالیں محمد یامین خاں کی تصنیف "نامۂ اعمال" میں جا بجا ملتی ہیں، جیسے جلد دوم ص ۵۹، ۹۰۷، ۱۰۵۶

بھی انجام دیتے تھے۔ [۹۶] قائداعظم کی نیابت اور بعض مواقع پر جانشینی میرنرنگ کی اہمیت اور وقعت کی ایک نمایاں مثال ہے۔

لیگ نے میرنرنگ سے آئینی اصلاحات و ترمیمات کا کام بھی لیا [۹۷]۔ مثلاً دہلی یونیورسٹی ترمیمی بل، جس میں لیگ نے چاہا تھا کہ یونیورسٹی کے اکثر شعبہ جات میں مسلمانوں کی کمی ہے اس کو پورا کیا جائے اور مسلمان اساتذہ کا اضافہ کیا جائے۔ لیگ نے اس بل میں ترمیمات کا کام میرنرنگ کے سپرد کیا تھا اور جسے منظور کرانے کے لیے میرنرنگ نے صبر اور استقلال کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا [۹۸]۔ وہ لیگ اور قائداعظم کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرتے رہے۔ لیگ کی ہر جدوجہد میں انھوں نے ایک معمولی ہرکارے کی طرح بھی کام کرنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ گو وہ ایک ممتاز اور قد آور قائد کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن لیگ کے لیے چندہ کی فراہمی [۹۹] اور عام انتخابات میں لیگ کے امیدواروں کی کامیابی [۱۰۰] کے لیے وہ بڑی مستعدی اور خلوص کے ساتھ ایک عام کارکن کی طرح بھی کام کر لیتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد بھی میرنرنگ کے گوشہ نشینی اختیار کرنے کے باوجود بہت اہم ذمہ داریاں حکومت کی جانب سے انھیں سونپی گئیں۔ جب پاکستان میں پہلی قومی اسمبلی وجود میں آئی، جو پہلی مجلس دستور ساز بھی تھی، تو میرنرنگ اس کے رکن نامزد ہوئے۔ حکومت نے انھیں ایک سہ رکنی مجلس کا رکن بھی بنایا، جس کا کام صوبۂ پنجاب کے حلقہ ہائے انتخاب طے کرنا اور طریق انتخاب کے ضمن میں سفارشات مرتب کرنا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں گورنر پنجاب نے انھیں اپنا ایک خصوصی مشیر بھی مقرر کیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ نے انھیں جھنگ پہنچ کر، جہاں میرنرنگ مقیم تھے، پنجاب اسمبلی کے اسپیکر بننے کی پیش کش کی تھی لیکن میرنرنگ راضی نہ ہوئے

---

[۹۶] صدیق علی خاں "بے تیغ سپاہی" ص ۳۲۰

[۹۷] محمد یامین خاں "نامۂ اعمال" جلد دوم، ص ۸۹۸

[۹۸] ایضاً، ص ۹۰۲، ۹۰۴

[۹۹] کئی مواقع پر میرنرنگ نے قائداعظم کی درخواست پر چندہ کی فراہمی کا کام کیا، قائداعظم کے کاغذات میں ایسی متعدد اسناد موجود ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، مثلاً "قائداعظم پیپرز" الف۔ ۹۷، ص ۱۴۱-۱۴۲ الف ۳۸۹ ص ۱۱-۱۲؛ الف ۱۵۰ ص ۳۶۹، ۳۴۷، ۳۶۰؛ الف ۱۵۳ ص ۱۷-۲۱؛ الف۔ ۱۱۴۴ ص ۳۰

[۱۰۰] مثلاً قائداعظم کے نام ان کے ایک مکتوب، مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۵ء، "قائداعظم پیپرز" الف۔ ۳۸۹ ص ۲۲-۲۳ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے منظم منصوبہ کے تحت انتخابات کے لیے کام کرتے تھے اور ایسے مواقع پر قائداعظم کو مشورے بھی دیتے تھے۔

ہوئے [۱۰۱] آخر وقت تک میر نیرنگ پاکستان دستوریہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری نباہتے رہے اور ترقی اور تنظیم کا کوئی کام ایسا نہیں تھا جس میں وہ نوجوانوں کی سی ہمت و مستعدی سے شریک نہ ہوئے ہوں [۱۰۲]

میر نیرنگ کی ساری سیاسی زندگی خلوص، مستعدی اور بے لوثی سے عبارت ہے۔ جاہ و حشم اور عہدہ اور منصب سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہے۔ اپنی صلاحیتوں کے سبب انھیں جو کچھ ملا، اس کی انھوں نے کبھی خواہش اور کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی ساری سیاسی جدوجہد میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ اور آزادی کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی بھرپور صلاحیتوں سے مسلم لیگ اور اس کی تحریک کو مرکزی مجلس دستور ساز میں اور اس کے باہر متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ عام مسلمانوں کو بھی ان کی جدوجہد اور ان کی لیاقت سے کئی اہم فائدے حاصل ہوئے۔ مرکزی مجلس دستور ساز میں ان کا ایک اہم کارنامہ ایک مسودۂ قانون تھا جو انھوں نے پیش کیا اور جسے عرف عام میں "شریعت بل" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں وراثت اسلامی اصولوں کے مطابق تقسیم ہونی چاہیئے [۱۰۳] وہ اس مسودۂ قانون پر غور کرنے والی ذیلی مجلس کے رکن بھی نامزد ہوئے [۱۰۴] اسی طرح کا ایک اور مسودہ قانون انھوں نے مسلمان خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں پیش کیا، جسے "خلع بل" سے موسوم کیا جاتا ہے [۱۰۵] میر نیرنگ نے مجلس دستور ساز میں ایک ایسی قرارداد بھی پیش کی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ بلوچستان کو بھی وہی اصلاحات دی جائیں جو

---

[۱۰۱] شمس الدین پیرزادہ، مقالۂ مذکور

[۱۰۲] عاشق حسین بٹالوی "چند یادیں چند تاثرات" (لاہور ۱۹۶۹ء) ص ۱۵۶

[۱۰۳] ایضاً، اس کی حمایت میں مجلس دستور ساز میں میر نیرنگ کی تقاریر کے لیے LEGISLATIVE ASSEMBLY DEBATES (مطبوعہ ۱۹۳۷) یکم اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۵۳۲ - ۲۵۳۷

[۱۰۴] محمد یامین خان "نامۂ اعمال" جلد اول ص ۹۷۵

[۱۰۵] اس کی تیاری کا علم سر فضل حسین کے مکتوب اور ان کی یادداشت سے بھی ہوتا ہے، ملاحظہ فرمایئے، مکتوب بنام ظفر اللہ، مورخہ ۲۷ اگست ۱۹۳۵ء، مشمولہ LETTERS OF FAZL-I-HUSAIN ص ۴۴۵؛ نیز DIARY AND NOTES OF FAZL-I-HUSAIN مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (لاہور ۱۹۷۷ء) ص ۱۶۷؛ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو اس مسودۂ قانون کے تعلق سے میر نیرنگ نے قائد اعظم کو ایک خط لکھ کر اس مسودہ پر مجلس دستور ساز میں پیش آنے والی صورت حال سے آگاہ کیا ــــ "قائد اعظم پیپرز" ایف۔ ۳۸۹ ص ۱-۲؛ و نیز مجلس دستور ساز میں اس موضوع پر ان کی تقاریر کے لیے: "LEGISLATIVE ASSEMBLY DEBATES" (مطبوعہ، ۱۹۳۸ء) ۳ فروری ۱۹۳۸ء، ص ۳۱۵، ۳۲۱۔

دوسرے صوبوں کو حاصل ہیں[۵۰]۔ میر نیرنگ جب تک مجلس دستور ساز کے رکن رہے ہمیشہ موقع ملنے پر مسلمانوں کے روزمرہ کے عام مسائل سے لے کر بڑے اور قومی اہمیت کے حامل مسائل تک کو بڑی جرأت اور استقلال کے ساتھ پیش کرتے رہے[۵۱]۔ وہ جس طرح لیاقت اور بلاغت کے ساتھ قومی، تہذیبی اور مذہبی مسائل پر مجلس دستور ساز میں مدلل اور جامع تقریریں کرتے تھے، اسی طرح مالیاتی اور تجارتی امور پر بھی اپنے زور بیان اور ذہن رسا کا ثبوت دیتے تھے۔

میر نیرنگ کی مخلصانہ کوششیں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی جاری رہیں۔ وہ آل انڈیا ریلوے ایڈوائزری بورڈ اور "نارتھ ویسٹرن ریلوے بورڈ" کے بھی رکن تھے اور قیام پاکستان کے بعد "پاکستان ریلوے بورڈ" کے رکن رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انھیں انجمن مہاجرین کا صدر منتخب کیا گیا۔ انھوں نے مہاجرین کی آبادکاری کے لیے بھی مفید خدمات انجام دیں۔

قائداعظم کو میر نیرنگ کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔ مرکزی مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ پارٹی کے "ڈپٹی لیڈر" بنائے جانے میں قائداعظم کی رضامندی بھی ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کی ایک صورت تھی۔ قائداعظم نے قیام پاکستان کے بعد یوم آزادی کی تقریب میں شرکت کے لیے انھیں پاکستان آنے کی دعوت دی تھی جس کے نتیجہ میں میر نیرنگ کراچی پہنچے لیکن اسی اثنا میں مشرقی پنجاب میں بڑے پیمانہ پر مسلم کش فسادات شروع ہو جانے کے سبب وہ یہیں رک گئے۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنے اہل خانہ کو بھی پاکستان بلوا لیا۔ میر نیرنگ نے کچھ عرصہ لاہور میں قیام کیا لیکن پھر راولپنڈی چلے گئے اور وہاں وکالت شروع کی، جو فوری طور پر جم نہ سکی لہٰذا وہ جھنگ منتقل ہو گئے۔ وکالت یہاں بھی جم نہ سکی۔ کچھ زرعی اراضی تھی، جس پر وہ خاموشی کے ساتھ گزارا کرتے رہے۔ اس عرصہ میں انھیں دو صدمات برداشت کرنے پڑے۔ ان کی اہلیہ نے مارچ ۱۹۴۹ء میں وفات پائی پھر جون میں ان کی اکلوتی بیٹی کے شوہر ڈاکٹر سید ظفرالحسن کا انتقال ہو گیا۔ میر نیرنگ نے یہ دونوں صدمے برداشت کیے لیکن ان کا اثر ان کی صحت پر پڑا۔ انھیں اختلاج قلب کی شکایت پیدا ہوئی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

میر نیرنگ شخصیت کے لحاظ سے وجیہہ اور بارعب تھے۔ رنگ دودھ کی طرح، آنکھیں بڑی اور غلافی،

---

[۵۰] محمد یامین خان، "نامۂ اعمال" جلد اول، ص ۵۶، ۵۷

[۵۱] مثلاً ۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کے اجلاس میں انھوں نے نچلے درجہ کے ملازمین کے سرکاری مکانات میں سہولتوں کے فقدان پر گفتگو کی، "۷۸۵" (مطبوعہ ۱۹۳۵ء) ص ۱۰۳۷، ۱۰۳۸؛ اور گورنمنٹ آف انڈیا پریس کے مسلمان ملازمین کو نماز جمعہ کے لیے ایک گھنٹہ کی اجازت کا مسئلہ چھیڑا، ایضاً، ص ۱۰۲۹؛ درگاہ حضرت معین الدین چشتیؒ کے لیے تحریک پیش کی، ایضاً، ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء، ص ۳۳۸۴، ۳۴۰۱ ـ ۳۴۰۳

سیاہ اور روشن، پیشانی فراخ، جسم مضبوط اور گٹھا ہوا، قد درمیانہ، داڑھی گھنی، لہجہ ملائم اور ہموار تھا۔ غصہ اور اشتعال سے بچتے رہتے، تقریر مؤثر ہوتی تھی۔ بات ایسی کرتے تھے کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتی تھی۔ [۱۰۸] پابند صوم و صلوٰۃ تھے [۱۰۹] سادہ مگر صاف ستھرا لباس زیب تن کرتے، انگریزی لباس پہنتے تھے لیکن اسے ترک کر کے عموماً قمیص پاجامہ پہنا کرتے اور اچکن استعمال کرتے تھے [۱۱۰] طبیعت میں بڑی شگفتگی اور لطافت تھی ہر بات میں مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے تھے بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر کے انتظامی معاملات سے بے نیاز رہتے تھے۔ مہمان داری بہت عزیز تھی ہمیشہ گھر میں مہمانوں کا سلسلہ بندھا رہتا طبیعت میں قناعت اور نفس کشی بھی بہت تھی۔ پر تکلف غذا بھی پسند نہیں تھی۔ رشتہ داروں سے طبقاتی اور سماجی امتیاز و تفریق کے بغیر روابط رکھنے کے قائل تھے۔ رشتہ داروں کے بچوں کی تعلیم اور ان کی بود و باش کا انتظام بھی گھر میں رہتا۔ یتیم بچوں اور مستحق بیواؤں کی ساری زندگی امداد کرتے رہے سچائی اور راست گوئی کو پسند کرتے تھے۔ دل کے بہت صاف تھے۔ استقامت اور مستقل مزاجی ان کی ساری زندگی میں جھلکتی رہی عزم راسخ تھا، چنانچہ اگر کبھی کوئی فیصلہ کر لیتے تو اسے تکمیل تک پہنچاتے۔ تانگہ رکھنے اور گھوڑا پالنے کا شوق تھا۔ دوسرا مشغلہ کتب بینی تھا۔ اس شوق میں گھر میں ایک کتب خانہ ترتیب دیا تھا جس میں زیادہ تر ادب اور مذہب کے موضوعات پر کتابیں تھیں۔ اس میں نادر و کمیاب اور قلمی کتابیں بھی موجود تھیں، لیکن یہ تقسیم ملک کے فسادات میں ضائع ہو گیا [۱۱۱] فارسی اور انگریزی زبانوں میں اچھی دستگاہ تھی، بلکہ انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ [۱۱۲] انگریزی ادب کا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا۔ بعض انگریزی نظموں کے تراجم بھی کیے، جو ان کے مجموعے میں موجود ہیں شیکسپیئر کا خصوصی مطالعہ تھا۔ اس کے ڈراموں کی جزئیات اور تفصیلات سے خوب واقف تھے اور ان کی تشریح و تصریح عمدگی اور مہارت کے ساتھ کر سکتے تھے۔

میر نیرنگ کی تصانیف میں "کلام نیرنگ" ان کی منظومات اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ۱۹۰۷ء میں اور دوسرا اضافوں کے ساتھ ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا۔ اپنے مرشد حضرت اشرفی کچھوچھوی کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کا مجموعہ "تحائف اشرفی" کی ترتیب و اشاعت بھی انہی کے

---

[۱۰۸] شمس الدین پیرزادہ، مقالہ مذکور۔

[۱۰۹] "پابندی صوم و صلوٰۃ میں ایسے مسلمان ممبر بہت کم ہیں"۔ مولوی فیروزالدین "داستان پاکستان" (لاہور ۱۹۴۵ء) ص ۲۸۱

[۱۱۰] روایت، منقول: سید قاسم حسین رضوی، مقالہ مذکور ص ۷۰

[۱۱۱] ایضاً، ص ۷۱

[۱۱۲] اس بارے میں کئی روایتیں شمس الدین پیرزادہ نے مقالہ مذکور میں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل زبان اور انگریزی داں اساتذہ ان کی انگریزی زبان کی لیاقت کے معترف تھے۔

حصہ میں آئی تھی۔ اس کے بھی دو ایڈیشن پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں اور دوسری مرتبہ قیام پاکستان کے بعد کراچی سے شائع ہوئے۔ میرنیرنگ نے اس کے آغاز میں اپنے مرشد کے مختصر حالات تحریر کیے، اور ان کے کلام پر مختصر رائے دی۔ اپنی تحریک تبلیغ کے سلسلہ میں میرنیرنگ نے "غبار افق" کے نام سے ہندوستان میں ارتداد کی ایک مفصل تاریخ تحریر کی، جس میں ہندو رہنماؤں کی ریاکاری اور تمام ہندو اقوام کا "شدھی" اور "سنگھٹن" جیسی تحریکوں کے وسیلہ سے مسلمانوں کے خلاف عملاً شریک و معاون ہونا دکھایا گیا ہے۔ یہ کتاب "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام" کے زیر اہتمام دو مرتبہ شائع کی گئی۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ میرنیرنگ سے چند روداویں اور کتابچے اور خطبات بھی یادگار ہیں۔ جو انھوں نے مختلف مواقع پر بطور خطبات صدارت پیش کیے۔ "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کی، اسالہ خدمات کا خلاصہ"، "جمعیۃ مرکزیہ تبلیغ الاسلام کے مختصر حالات"، "مجلس خادمانِ حرمین" اور "ریاست الور اور اس کی مسلم رعایا" (اردو اور انگریزی) بھی ان سے یادگار ہیں۔ ان تصانیف کے ساتھ ساتھ میرنیرنگ کے وہ متعدد مقالات اور مضامین بھی ہیں جو مختلف رسائل بالخصوص "مخزن"، "زمانہ"، "ہمایوں"، "علیگڑھ اولڈ بوائز" وغیرہ اور خود ان کے رسالہ "تبلیغ" میں شائع ہوئے۔ سیاسی اور قومی مسائل پر ان کی تحریریں اس وقت کے مؤقر اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ "انقلاب" (لاہور)، "زمیندار" (لاہور)، "پیسہ اخبار" (لاہور)، "وکیل" (امرتسر)، "سچ" (لکھنؤ)، "خلافت" (بمبئی) وغیرہ میں ان کی اس نوع کی متعدد تحریریں ملتی ہیں۔

میرنیرنگ ادب کا فطری ذوق رکھتے تھے لیکن ان کے ذوق کی نشو و نما ان کے لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں ہوئی، جہاں چند باذوق دوستوں سے ان کے روابط استوار ہوئے۔ ان دوستوں میں ایک چودھری جلال الدین تھے، جو سیالکوٹ سے لاہور آکر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اور میرنیرنگ بورڈنگ ہاؤس میں ساتھ ہی رہتے تھے۔ انھیں شعر کا خاص ذوق تھا اور اس کی پرورش علامہ اقبال کے استاد سید میر حسن کی صحبت میں ہوئی تھی۔ انھی کے توسط سے میرنیرنگ علامہ اقبال سے متعارف ہوئے اور اس تعارف سے دوستی کا ایک گہرا رشتہ استوار ہوا۔ اس وقت تک میرنیرنگ شعر کہنے لگے تھے اور اس میں مہارت بھی پیدا کرلی تھی، آغاز میں انھوں نے "مواج" تخلص اختیار کیا تھا، جسے جلد ہی تبدیل کر کے نیرنگ کرلیا۔[۱۱۳]

علامہ اقبال سے رفاقت اور ذوق کی مطابقت نے میرنیرنگ کے ذوقِ شعری اور مشقِ سخن میں جلا پیدا

۱۱۳۔ مولانا ابوسعید شعیب کی تصنیف "مختصر العروض"، مطبوعہ لاہور، ۱۳۱۳ھ (مطابق ۱۸۹۵ء) پر میرنیرنگ کا ایک قطعۂ تاریخ درج ہے، جس پر میرنیرنگ کا تخلص "مواج" التحریر ہے۔

کی اور دونوں میں اشعار کا تبادلہ ہونے لگا[۱۱۴] اس سلسلہ میں میرنیرنگ نے اقبال کو جو اشعار بھیجے، ان میں سے صرف یہ ایک شعر انہیں بعد میں یاد رہ گیا ـــــ جو اُن کے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں۔

حرم کو جا جناب زاہد یہ ساری ظاہر پرستیاں ہیں
میں اس کی رندی کو مانتا ہوں جو کام دے دیر سے حرم کا[۱۱۵]

مشق سخن کے لیے اقبال اور میرنیرنگ ایک ہی زمین میں ایک ساتھ طبع آزمائی بھی کر لیا کرتے تھے مثلاً ان دونوں کی یہ غزلیں جن کے مطالع درج ذیل ہیں۔

اقبال:

عبادت میں زاہد کو مسرور رہنا
مجھے پی کے تھوڑی سی مخمور رہنا[۱۱۶]

میرنیرنگ:

پریشاں ہے عاشق کا دستور رہنا
ترے جور سہہ کر بھی مسرور رہنا[۱۱۷]

میرنیرنگ نے جب اقبال ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے وطن واپس آئے تو ان کے استقبال میں ایک غزل لکھی تھی جو اقبال کی پسندیدہ زمین میں تھی۔ اس کا مطلع یہ تھا:

فصل بہار آئی پھر گلشن سخن میں
اک جشن ہو رہا ہے مرغان نغمہ زن میں

اس زمین میں اقبال کی مقبول نظمیں موجود تھیں، مثلاً:

"جگنو":

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

"سلیمیٰ":

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں میں
خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں

اس وقت میرنیرنگ کا ذوق شعری اور ان کے نقد و نظر کی صلاحیتیں پختگی کے مرحلہ میں تھیں مثلاً۔

---

[۱۱۴] میرنیرنگ نے اس وقت کی تفصیلات بیان کی ہیں: "اقبال کے بعض حالات" صفحات ۱۹-۲۴
[۱۱۵] ایضاً، ص ۲۱
[۱۱۶] "باقیات اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد اور محمد عبداللہ قریشی، طبع دوم (لاہور، ۱۹۶۶ء) صفحات ۴۲۱-۴۲۲
[۱۱۷] یہ غزل ۱۹۰۳ء کی تخلیق ہے "ہفتہ وار پنجۂ فولاد" (لاہور) میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۳ء کو شائع ہوئی تھی۔

اقبال کی ایک غزل کو دیکھ کر ان کی "آنکھیں کھل گئیں"، انھوں نے اس وقت تک اہل پنجاب کی اردو شاعری کے جو نمونے دیکھے تھے، ان کو دیکھ کر وہ اہل پنجاب کی اردو گوئی کے معتقد نہ تھے، مگر اقبال کی غزل دیکھ کر انھوں نے اپنی رائے بدل لی اور ان کو معلوم ہوگیا کہ ذوقِ سخن کا اجارہ کسی خطۂ زمین کو نہیں دیا گیا۔[۱۱۸]

میر نیرنگ گورنمنٹ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں چار سال تک مقیم رہے۔ ان میں تین سال ایسے تھے کہ اقبال اور دیگر باذوق دوستوں کے ساتھ ان کی صحبتیں برقرار رہیں۔ ان صحبتوں میں ادبی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ شعر کہے بھی جاتے اور پڑھے بھی جاتے تھے[۱۱۹]۔ اس دوران میر نیرنگ لاہور کے قدیم مشاعروں میں بھی، جو بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں حکیم امین الدین بیرسٹر اور حکیم شہباز الدین کے مکان پر منعقد ہوتے تھے، شریک ہو کر داد سخن دیتے تھے[۱۲۰]۔ اقبال بھی میر نیرنگ کی شاعری کے مداح تھے اور انھیں اور نادر کاکوری کو اپنا "ہم صفیر" بیان کرتے تھے:

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

یہی دور تھا کہ جب شیخ عبدالقادر نے لاہور سے "مخزن" جاری کیا، جو ایک دلبستان کا محرک اور مرکز بنا۔ شیخ عبدالقادر نے "مخزن" کے ذریعہ یہی کوشش کی کہ پنجاب کو اردو زبان و ادب کا مرکز بنا دیں اور لکھنؤ اور دہلی کے جو دبستان اجڑ چکے ہیں اسے ایک نیا رنگ دے کر لاہور میں سجا دیں۔ یہ رسالہ بہت مقبول ہوا اور اپنے حلقہ اور اثر کے سبب تاریخ ساز ثابت ہوا۔ اس نے نئے نئے ادیبوں و شاعروں کے افکار و خیالات سے زبان و ادب میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی اور ایک ایسی محفل سجا دی جس میں اس زمانہ کے ممتاز ادیب و شاعر شریک ہو گئے۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی، خوشی محمد ناظر، میر نیرنگ، مرزا اعجاز حسین، سجاد حیدر یلدرم، شیخ محمد اکرام وغیرہ اس کے مستقل لکھنے والوں میں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، دیا نرائن نگم نے اسی رسالہ سے اپنے ذوقِ علم و ادب کی آبیاری کی۔ یہ رسالہ ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا تھا۔ اس کے اجرا کے لیے جو مشورے ہوئے تھے، ان میں مرزا اعجاز حسین اور میر نیرنگ بھی شریک ہوئے[۱۲۱]۔ اس میں میر نیرنگ

---

[۱۱۸] "جب بندشوں کی ایسی چستی، کلام کی ایسی روانی اور مضامین کی یہ شوخی ایک طالب العلم کے کلام میں ہے۔ تو خدا جانے اسی پنجاب میں کتنے چھپے رستم پڑے ہوں گے جن کا حال ہم کو معلوم نہیں۔ خیر اوروں کو تو چھوڑیے اقبال کا تو میں قائل ہو ہی گیا۔" "اقبال کے بعض حالات" ص ۲۱

[۱۱۹] ایضاً، ص ۲۲

[۱۲۰] محمد عبداللہ قریشی "معاصرین اقبال کی نظر میں" ص ۶۳

[۱۲۱] میر نیرنگ "اقبال کے بعض حالات" ص ۲۷

کے رشحات نظم ونثر مستقل طور پر شائع ہوتے تھے۔ "مخزن" کے ہر شمارہ پر میرنیرنگ مفصل تبصرہ لکھ کر شیخ عبدالقادر کو بھیجا کرتے تھے[۱۳۲]۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔ اس سال جب شیخ عبدالقادر وکالت کے امتحان کے لیے انگلستان گئے تو انھوں نے میرنیرنگ کو لاہور بلا کر "مخزن" ان کے سپرد کر دیا میرنیرنگ ان کی غیر موجودگی میں بلا اظہار نام اس کے مدیر رہے اور شیخ محمد اکرام نائب مدیر اور مہتمم۔ وہ تمام مضامین ڈاک کے ذریعہ میرنیرنگ کے پاس بھیج دیا کرتے تھے اور میرنیرنگ ان کی اشاعت کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے[۱۳۳]
میرنیرنگ کی علمی وادبی تحریریں اور منظومات زیادہ تر "مخزن" ہی میں شائع ہوئیں۔ لیکن وہ کبھی کبھی دوسرے رسائل میں بھی لکھا کرتے تھے۔ "مخزن" کے توسط سے ان کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہو گیا تھا اور وہ اپنی نظم ونثر کے حوالے سے دنیائے علم وادب میں پہچانے جانے لگے تھے۔ انھوں نے زیادہ تر تنقیدی مضامین لکھے، لیکن بعض متنوع اور ادبی وعلمی موضوعات پر بھی ان کے مضامین ملتے ہیں۔ افسانہ نگاری کی طرف جس کا ایک عام رجحان اس زمانہ میں پیدا ہو رہا تھا، انھوں نے خود تو توجہ نہیں کی لیکن ان کی خوش مذاقی اور حسن شناسی اردو کے جدید افسانوی ادب کے حق میں بھی، بڑی نتیجہ خیز اور دور رس ثابت ہوئی۔ انھوں نے سجاد حیدر یلدرم کو، جو اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہیں[۱۳۴]، "خیالستان" میں شامل قصوں کے لکھنے یا تلخیص کرنے کی ہمت دلائی اور انھیں مجموعے کی صورت میں "خیالستان" کے نام سے شائع کرنے کے لیے اصرار کیا[۱۳۵]۔ میرنیرنگ نے "خیالستان" پر تمہید لکھی اور یلدرم نے "خیالستان" کو اپنے "دو عزیز دوستوں" نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خاں شروانی اور میرنیرنگ کے نام معنون کیا۔
میرنیرنگ کے کلام میں غالب کے اثرات بھی جھلکتے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب سے متاثر تھے اور اس اثر کو تسلیم بھی کرتے تھے:

غزل میں لطف ہی اب کیا ہے لیکن کچھ جو باقی ہے
سو تقلید ادائے غالب معجز بیاں تک ہے

ان کے بعض اشعار میں غالب کے انداز کی جھلک نمایاں ہے،

مرا ہر لفظ سادہ اک صدف ہے دُرِ معنی کا
سمجھ پیدا کرے تو کوئی سمجھے گفتگو میری
سلاست مانع مشکل پسندی ہو نہیں سکتی
ادق ہے حضرت نیرنگ طرز گفتگو میری

---

[۱۳۲] ایضاً۔ [۱۳۳] ایضاً۔
[۱۳۴] بلکہ پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن "مطالعہ یلدرم" (لاہور، ۱۹۸۱) ص ۳۹
[۱۳۵] پطرس بخاری "سید سجاد حیدر۔ متمولہ نگ نظمی" (امرتسر) "یلدرم نمبر" شمارہ ۵ جلد ۹ ص ۱۰۲

انھوں نے غالب کی مشہور زمینوں میں بھی غزلیں کہی تھیں۔ مثلاً ان کی یہ غزلیں:

دل لگانا کوئی آفت ہی سہی
اب تو جھیلیں گے مصیبت ہی سہی

فغان و آہ کس امید پر کرے کوئی
وہ کہتے، ترے نالوں سے کیوں ڈرے کوئی

میرنیرنگ ادب و شعر کا وسیع مطالعہ اور بہت پختہ شعور رکھتے تھے۔ وہ ایک اچھے نقاد بھی تھے۔ ان کی تنقیدوں اور "مخزن" پر ہر ماہ ان کے لکھے ہوئے تبصروں سے "مخزن" اور اس کے معیار کو بہت فائدہ پہنچا۔ اقبال کی شاعری کے اولین دور میں جب اہل زبان ان کے کلام میں زبان و بیان کے عیب نکالتے تو میرنیرنگ "انبالوی" اور "پنجابی" کے قلمی نام سے اقبال کی پشت پناہی کرتے۔ انھوں نے جو علمی و ادبی مضامین اور تنقیدی جائزے تحریر کیے ــــ وہ اپنی جگہ اہم تو ہیں، لیکن ادبی دنیا میں ان کی شہرت کا زیادہ تر انحصار ان کی شاعری پر ہے۔ گو ادب کی تاریخوں اور جائزوں میں ان کا نام مصنفین کی مستقل توجہ حاصل نہیں کرسکا لیکن پھر بھی جدید شاعری کی تاریخ میں، جس کا آغاز حالی اور آزاد کے دور سے ہوتا ہے، ان کی اپنی ایک اہمیت ہے اور اپنے دور میں انھیں ایک جدید شاعر کی حیثیت سے خصوصاً دل کش اور پرکیف نظمیں لکھنے کی وجہ سے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔

جدید شاعری کی تحریک کو پنجاب میں بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا تھا۔ اس میں ناظم تعلیمات پنجاب کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی کو بہت دخل تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اردو شاعری کو زندگی کے حقائق اور واقعات سے قریب لایا جائے اور تصنع اور تکلف کو ترک کر دیا جائے۔ تشبیہ اور استعارے عام زندگی سے تلاش کیے جائیں تاکہ شاعری زیادہ مؤثر ہو سکے۔ بنیادی طور پر اس تحریک کے دو شاعرانہ نصب العین تھے۔ سادگی اور واقعیت ــــ جنھیں "نیچرل شاعری" کی بنیاد کہا گیا۔ یہ تحریک انگریزی شاعری سے متاثر تھی لیکن جو شاعر اس تحریک میں پیش پیش تھے، ان میں صرف ایک یا دو شاعر ایسے تھے جو انگریزی زبان اچھی طرح سے جانتے تھے۔ زیادہ تعداد ایسے شاعروں کی تھی جو انگریزی سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے اور اس سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ حالی اور آزاد کے معاصر شعرا کے بعد جو نئے شاعر، مثلاً سرور جہاں آبادی اور نادر کاکوروی، نمایاں ہوئے انھوں نے جدید شاعری کے اصل سرچشمہ یعنی انگریزی زبان و ادب سے واقفیت کی وجہ سے اردو شاعری کو مشاہدات فطرت اور قومی اور انفرادی جذبات سے بھر دیا۔ یہ دونوں شاعر حالی اور اقبال کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرنیرنگ اقبال کے معاصر شاعروں میں ہیں اور اس وجہ سے اہمیت رکھتے ہیں کہ

انگریزی زبان وادب پر انھیں عبور حاصل تھا اور شاعری کا وہ ایسا ستھرا ذوق رکھتے تھے کہ انگریزی شاعری کے عمدہ نمونوں کو اردو میں بھی کمال مہارت اور خوبی اور دل کشی کے ساتھ منتقل کر سکیں چنانچہ ان کے کلام میں جو نظمیں انگریزی زبان سے ماخوذ ہیں وہ الفاظ کی سادگی، مضامین کی واقعیت اور ندرت اظہار سے اسی طرح ہمکنار ہیں کہ ان پر ترجمہ کا گماں نہیں ہوتا۔ مثلاً،

اچھا بس کوچ کر یہاں سے — یہ بھی نہ بتا کہ کب ہے رحلت
دل میں جب تیرے آئے چل دے — جو تجھ کو پسند آئے ساعت
مت کہہ مجھے اَلفِراق! اَلبَین! — دکھلا مت روئے شام غربت
کل صبح وطن کو شاد و خنداں — ملنا مجھ سے بصد مسرت

(جان شیریں)

ہوائیں ہوگئیں خاموش وقت شام آپہنچا
اندھیرا چھا گیا ہر سمت عالم ہے خموشی کا
نہیں پائے صبا تک کی ذرا آہٹ گلستاں میں
اسی عالم میں آنکلا ہوں میں شہر خموشاں میں
دل مہجور میں اک لالہ زار داغ لایا ہوں
میں اپنے گل کی تربت پر چڑھانے پھول لایا ہوں

(تربت جاناں)

میرنیرنگ کی ساری شاعری میں، چاہے تراجم ہوں یا طبعزاد، ایک انفرادی خلوص، بے تکلفی اور سادگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ اپنے خیالات، احساسات اور تجربات و مشاہدات کو رنگین الفاظ کے پردے میں چھپنے نہیں دیتے۔ معمولی خیالات کو بھی اپنی خوش بیانی سے دل کش بنا دیتے ہیں۔ ان کے خیالات براہ راست لفظوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ایسی بے تکلفی سے۔ ساتھ شعر کہتے چلے جاتے ہیں کہ واقعیت محو نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری میں سادگی اور بے تکلفی اس قدر نمایاں ہے کہ اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے دوش بدوش کھڑے نظر آتے ہیں:

صیاد حادثے کا کرتا ہے میرا پیچھا — مرغ بریدہ پر ہوں صید شکستہ پا ہوں
ہے ذات میری مجمع ساری برائیوں کا — کہنے کو میں بڑا ہوں لیکن بہت برا ہوں
اک بات ہو بتاؤں اک درد ہو سناؤں — روؤں بھلا کہاں تک کب تک پڑا کراہوں

اس جستجو میں میں نے کی سیر طور و ایمن — پربت کو گھر بنایا جنگل سے لو لگائی

مندر کو جا کے دیکھا گرجا میں جا کے ڈھونڈا — مسجد کو چھان مارا اس کی نہ دید پائی
جوگی کا روپ دھارا بن میں کیا گزارا — تن پر بھبھوت مل کر دھونی بہت رمائی
جپ تپ میں عمر اپنی کی میں نے تیر اکثر — بن بن کے پیر راہب جا خانقہ بسائی
صوفی بھی بن کے دیکھا اور رند بے ریا بھی — کر نعرۂ انا الحق اک کھلبلی مچائی
پھرتی ہیں ماری ماری مشتاق جلوہ آنکھیں — پر اک جھلک سے بڑھ کر دیتا نہیں دکھائی
بے فائدہ ہے ساری یہ عقل کی تگاپو — تا منزل حقیقت ممنوع ہے رسائی

(انسان کی فریاد)

ان کے کلام میں انسانی جذبات و احساسات اور کیفیات کی بہت عمدہ صورتیں بھی ملتی ہیں:

امید کے وہ وعدے جھوٹی ہوائیاں تھیں — سب جو فروشیاں تھیں گندم نمائیاں تھیں
دن رات کوششیں تھیں اور نارسائیاں تھیں — دھوکے کا تو نے پردہ آخر کو آ اٹھایا

اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

(راحت یاس)

عزم رہِ اخوت ہر اک طرح سے ٹھانا — فیاضیوں کا بیڑا سو سو طرح اٹھایا

گو اس میں موجزن تھی قوم و وطن کی الفت

لیکن غرض نے اس کو کچھ اور ہی سکھایا

(انسان کی فریاد)

طلب نے کھائی ہیں وہ ٹھوکریں راہ تمنا میں

کہ آخر مجھ سے شرمانے لگی ہے آرزو میری

یاد ماضی اس زمانہ کے ہر شاعر کا محبوب موضوع سخن تھا۔ میرنیرنگ کے کلام میں بھی اس کی بعض اچھی مثالیں ملتی ہیں:

کیا لطف کے تھے وہ دن کیا خوب زمانہ تھا

طفلی کی وہ سب باتیں کیا پیارا زمانہ تھا

دنیا میں بہت گھر ہیں اور ایک سے ایک اچھا

پر گھر تھا وہ کیا پیارا ہم جس میں ہوئے پیدا

میر نیرنگ کا زیادہ تر کلام منظومات پر مشتمل ہے اور ان میں بھی اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ ان نظموں میں انھوں نے زندگی کے حقائق لطیف پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ بالخصوص مناظر فطرت یا "نیچرل شاعری" میں ان کا انداز خاصا والہانہ اور مؤثر ہے:

مخمل کا فرش باغ میں سبزہ بچھا چکا — اب نو عروس گل کا فقط انتظار ہے
منہ موتیوں سے گل کا بھرا ہے بہار نے — جو قطرہ اس کلی ہے وہ در شاہوار ہے
غنچے کھلے ہیں یا ہیں کھلے نافہ ہائے مشک — یہ صحن بوستاں ہے کہ ملک تتار ہے
آتا نظر ہے سبزہ ہی سبزہ ہر اک جگہ — تار نگاہ کیا ہے زمرد کا تار ہے
پائی ہے وہ طبیعت موزوں بہار میں — گاتا ہر اک پرند مثال ہزار ہے

(فصل بہار)

یہ گرد چاند کے بادل نہیں سفید سفید — ہے دوش ناز پہ اوڑھے سفید چادر چاند
نچھے ہی جاتے ہیں بادل بہ شوق پامالی — خرام ناز میں ہے دلبروں سے بڑھ کر چاند

(چاندنی رات میں بادل)

باوجودیکہ یہ موضوعات اس دور کی اردو شاعری میں بہت عام ہو گئے تھے لیکن میر نیرنگ نے ان کو اپنے جذبات، احساسات اور مشاہدات کے توسط سے دلکش اور پرکیف بنا دیا ہے۔ ان کے اسلوب میں روانی اور سلاست بھی ہے اور سادگی اور جاذبیت بھی۔ انھیں اپنے خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل تھی ——— یہاں تک کہ غیر دلچسپ اور عام موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے تو انھیں اپنے اسلوب اور خوش بیانی سے دلآویز اور جاذب توجہ بنا دیتے اور نکتہ آفرینی سے کام لیتے۔ اس قسم کی نظموں میں "بھونرا"، "تلاش محبت"، "غار"، "مرجھایا ہوا پھول"، "ایک آنسو سے دو باتیں" وغیرہ خاص انفرادیت رکھتی ہیں۔

ان کی غزلیں بھی سادگی، بے ساختگی اور کیف و سرور کے لحاظ سے ایک انفرادی شان رکھتی ہیں۔ عشقیہ موضوعات ان کی غزلوں ——— بلکہ ساری ہی شاعری میں کم ہیں۔ عصری تقاضے اور قومی و سیاسی مضامین خاصے نمایاں ہیں۔ چونکہ ان کی زندگی مذہب و ملت کے درد سے معمور تھی اور یہی درد ان کی منظومات کا بھی حاوی موضوع تھا اس لیے غزلوں میں بھی اس کی کیفیت محسوس ہوتی ہے:

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن — کچھ مصیبت سی مصیبت ہے خدا خیر کرے
ابھی تشخیص مرض میں ہے مریضوں کو کلام — جاں ادھر درپے رخصت ہے خدا خیر کرے
رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتا رستے کا — راہبر پیکر حیرت ہے خدا خیر کرے

ہجر و وصال کیا کسی حالت میں کل نہیں　　ہیں تیرے ولولے دلِ ناداں عجیب سے
اے وائے نارسائیِ دستِ درازِ شوق　　اور آپ کا نکل کے وہ جانا قریب سے

میرے درد دل سے گویا آشنا ہیں چوب و تار　　اپنے نالے سن رہا ہوں پردہ ہائے ساز سے

میر نیرنگ قوم اور ملت سے جو خلوص اور ہمدردی رکھتے تھے اور خود کو جس طرح انھوں نے ملک اور ملت کے لیے وقف کر دیا تھا، اس کا اظہار ان کی شاعری کے ایک بڑے حصے سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی نظموں کا زیادہ حصہ قومی اور اصلاحی موضوعات پر مشتمل ہے۔ خصوصاً ان کی وہ نظمیں جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پڑھیں، ان کے درد قومی اور جوش و جذبہ کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ وہ اپنی ایسی نظموں میں ایک طرف حالی اور اقبال کی طرح ملت اسلامیہ کے نوحہ خواں نظر آتے ہیں [۱۲۶] تو دوسری طرف مسلمانوں کو بیداری، اصلاح اور رجوعِ اسلام کی دعوت دیتے ہیں [۱۲۷]۔ انھوں نے جس طرح خود ساری زندگی جہد و عمل اور خدمتِ قوم میں گزار دی، وہ قوم کو بھی اسی انداز کی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتے رہے۔ یہ موضوعات اور قوم سے خطاب کی یہ صورتیں اس زمانہ میں تقریباً ہر بڑے شاعر کے کلام میں ملتی ہیں۔ لیکن ایسے بہت کم شاعر گزرے ہیں جن کے کلام کا بڑا حصہ قوم سے خطاب اور اس کی اصلاح اور بیداری کے خیالات پر مبنی ہو۔ انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں مسلمانوں کو حرکت و عمل کی تلقین کی ہے۔

میر نیرنگ نے ملکی اور قومی مسائل سے بڑھ کر حیات و کائنات کے مسائل پر بھی نظر ڈالی ہے۔ ان کے اشعار میں زندگی اور اس کے مظاہر، حیات و کائنات کی حقیقت اور تصوف کے موضوعات، عشق اور بے ثباتیِ دنیا وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ ان کے فکر و نظر کی وسعتوں کا احساس بھی ان کے اشعار سے ہوتا ہے:

چھوڑ گئے کیا مرا ذوق طلب بھی تم نے دیکھا ہے　　ورائے لامکاں ہے انتہائے جستجو میری

مری نظروں میں زاہد اور ہی جلوے سمائے ہیں　　نظر تیری تو حسنِ حور و غلمانِ جناں تک ہے

یہ زندگیِ انساں اک خواب ہے پریشاں　　بیداریِ عدم ہے تعبیرِ خوابِ ہستی

---

[۱۲۶] ان کی نظمیں "حالت قوم"، "درد پنہاں"، "شرط زندگی" اس سلسلہ میں ان کے احساسات کی نمائندگی کرتی ہے۔

[۱۲۷] اس ضمن میں ان کی نظمیں "آہنگ عمل"، "نوائے انقلاب"، "پیغام عمل"، "شرط زندگی"، "کارزار ہستی" اور "صدائے اسلام" خاص توجہ کے لائق ہیں۔

دیکھیں اگر تو کیوں کر ہم جلوۂ معارف — تو ظلمت نظر ہے اے آفتاب ہستی

اے تشنۂ حقیقت دھوکے میں تو نہ آنا — اک دام پُر خطر ہے موج سراب ہستی

اردو شاعری کو جدید رجحانات اور بالخصوص قومی اور ملّی احساسات سے روشناس کرانے میں میر نیرنگ کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ ان کے اسلوب پر کلاسیکی رنگ سخن بھی حاوی ہے لیکن وہ عصری تقاضوں سے بھی آراستہ ہے۔ روایتوں کے تمام تر احترام کے باوجود اندازِ بیاں انفرادی اور جدا ہے:

ہے تو نیرنگ وہی عشق کا رونا دھونا

انھی باتوں میں نیا رنگ دکھا جاتے ہو

قومی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے شاعری کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی تھی [۱۲۳]، لیکن گاہے گاہے شعر کہہ لیتے تھے۔ ان کا سارا کلام محفوظ نہ رہا لیکن جس قدر دستیاب ہے وہ انھیں اپنے دور کے ایک بڑے اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت میں متعارف کرانے کے لیے کافی ہے۔ وہ پنجاب میں "سرسید اسکول" سے تعلق رکھنے والے شعرا کے گروہ کے ایک اہم رکن تھے۔ اپنے انتقال کے وقت وہ اس اسکول کی آخری یادگار کے طور پر رہ گئے تھے ـــــ ان کے ساتھ ساتھ سرسید اسکول کا یہ دور بھی اختتام پذیر ہوا۔

---

[۱۲۳] "ان کی لیلائے شاعری تبلیغ کے محمل میں بند ہو کر رہ گئی جس کا پردہ اب قیس کے لیے بھی نہیں اٹھتا" ـــ مولانا ظفر علی خان "نگارستان" (لاہور، طبع اوّل، ص ۹۲۔ "حالانکہ وہ صحیح معنوں میں شاعر تھے" مولانا محمد علی بنام میر نیرنگ، مشمولہ "مکتوبات رئیس الاحرار" مرتبہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری (کراچی ۱۹۷۸ء) ص ۲۱۰۔ "ان کو فطرت نے جوہر شعر گوئی ارزانی کیا تھا۔ انھوں نے خود اسے بہت اہمیت نہیں دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر بطریق تفنن کہتے رہے۔ اگر وہ سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوتے تو اچھے اچھے شعرا کا چراغ اُن کے سامنے نہ جل سکتا" عابد علی عابد "شعر اقبال" ص ۸۲۔ "اگر وہ اقبال کے شانہ بشانہ چل کر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے تو دوسرے اقبال ہوتے" محمد عبداللہ قریشی ـ "معاصرین اقبال کی نظر میں" ص ۸۵۔

کلامِ نیرنگ

تمہید

(طبع اوّل)

شیخ محمد اکرام صاحب اسسٹنٹ ایڈیٹر مخزن کے روز روز کے تقاضوں نے ناک میں دم کر دیا۔ ایڈیٹر صاحب کی عدالت میں اپیل کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہاں سے بھی شیخ محمد اکرام صاحب کا حکم بحال رہا۔ آخر مجبور ہو کر ان چند اوراق کے شائع کرنے کی اجازت دینی پڑی۔ ورنہ میں اس مختصر مجموعے کو اس قابل ہرگز نہیں سمجھتا کہ اہلِ سخن کی خدمت میں پیش کر دوں۔

سخن شناس ناظرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ میری اس جرأت کو مجبوری پر محمول فرمائیں۔

انبالہ شہر - ۲۲، جون ۱۹۰۶ء　　　　نیرنگ

تمہید

(طبع ثانی)

"کلامِ نیرنگ" ایک مختصر مجموعے کی صورت میں دس سال ہوئے سنہ ۱۹۰۸ء میں چھپا تھا۔ اور مخزن پریس لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ جو دلآویز نظمیں اور دلپذیر غزلیں میر نیرنگ صاحب کے قلم جادو رقم سے نکل کر اس وقت تک زیب اوراق "مخزن" ہوئی تھیں، وہ یکجا کر دی گئی تھیں۔ میر صاحب موصوف ایسے مختصر مجموعے کی اشاعت پر راضی نہ تھے۔ مگر میرا یہ خیال تھا اور ہے کہ چند اشعارِ نغز ایک ضخیم مجموعۂ بے مغز سے بہتر ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسے پُر معنی تخیلات ایک ماہوار رسالے کے اوراقِ پریشاں میں بکھرے رہیں۔ اس لیے میں نے اصرار کیا کہ یہ مجموعہ باوجود مختصر ہونے کے چھپ جائے۔ میر صاحب نے بادلِ ناخواستہ اس وقت اجازت دے دی۔ اتفاقاتِ زمانہ دیکھیے۔ اس کے بعد میر صاحب کی شاعری کا پہلا دور گویا ختم ہو گیا۔ گزشتہ سالوں میں کوئی ایک آدھ نظم یا غزل ہی کہی گئی ہوگی۔ کیونکہ میر صاحب وکیل سے سرکاری وکیل ہو گئے اور ہجومِ کارِ سرکاری نے فرصتِ کار و بارِ شوق سے محروم کر دیا۔ "مخزن" کے زمانۂ سابق کے ناظرین جانتے ہیں کہ میر صاحب نہ صرف نظم خوب لکھ سکتے ہیں بلکہ نثر میں بھی موتی پروتے ہیں۔ مگر نظم و نثر دونوں کا باب ان دنوں مسدود ہے۔ لوگ ان کی معذوری کو پوری طرح سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر میں اپنے ذاتی تجربے سے ان کی معذوری کو خوب جانتا ہوں کیونکہ ان کے بعد میں خود بھی اسی محکمے میں سلسلۂ ملازمت میں آگیا۔ اور تب سے علمی دنیا سے عملاً منقطع ہو گیا۔ البتہ یہ آرزو ہے کہ کبھی زمانہ مساعدت کرے تو اس تعلق سے فراغت کے بعد پھر ذوقِ علمی کو تازہ کیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے دوست میر نیرنگ صاحب کو بھی ضرور یہ دھن ہوگی۔ اسی بنا پر میں نے ان کی ۱۹۰۷ء تک کی شاعری کو پہلے دور سے موسوم کیا ہے۔ جس میں کسی آنے والے دوسرے دور کی امید اور پیشین گوئی مضمر ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہو۔ اور ایک اور مجموعہ ان کی نظم کا ایسا چھپے جو ہر دو دور کا جامع ہو۔ لیکن جب تک وہ وقت نہیں آتا لازم ہے کہ یہ مجموعہ اہل نظر کے سامنے رہے۔ اس لیے میرے خیال میں منشی فضل الٰہی مرغوب رقم شائقین ادب اردو کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے میر نیرنگ صاحب سے ان کا کلام دوبارہ شائع کرنے کی اجازت باصرار حاصل کی۔ پہلے نسخے کے بھی خطاط منشی فضل الٰہی صاحب تھے، اب دوسرا نسخہ جو انھوں نے اپنے اہتمام سے مرغوب ایجنسی لاہور کی طرف سے شائع کیا ہے عجب نہیں کہ ظاہری صورت میں نقشِ اوّل سے بہتر رہے۔ تقطیع پہلے مجموعے سے کسی قدر بڑی رکھی گئی ہے۔ چند نظمیں جو کہیں اور شائع ہوئی تھیں تلاش سے بہم پہنچا کر اضافہ کی گئی ہیں۔ اور قوی امید ہے کہ یہ اشاعت بیش از بیش مقبول ہوگی۔

لائل پور۔ دسمبر ۱۹۱۶ء

عبدالقادر (سابق ایڈیٹر مخزن)

معذرتؒ

نیرنگیٔ زمانہ سے لاعلم انسان ہر چند اپنے ارادوں میں کامیابی کی راہیں نکالنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا لیکن آخر وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

مئی ۱۹۱۴ء کا ذکر ہے جب جناب سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے (انبالہ) سے "کلام نیرنگ" کے اس ایڈیشن کی اشاعت کے واسطے (بالاصرار) اجازت حاصل کی تھی۔ اس وقت مصمم ارادہ یہی تھا کہ اسے چند ماہ کے اندر ضرور ہی شائع کر دیا جائے گا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی خیال دامن گیر ہوا کہ کسی نہ کسی صورت سے اسے (بحکم نقش ثانی) دلچسپ بنایا جائے۔ لہٰذا سب سے پہلے فوٹو کی تلاش ہوئی۔ ایک عرصے کے بعد گروپ ہاتھ لگا۔ جس سے تصویر ملحقہ لے کر بلیٹ بننے کے لیے بھیج دی گئی۔ بلیٹ کے جلدی نہ تیار ہونے کے لپیٹ میں حد سے زیادہ لیٹ ہو گئی۔ اور کچھ مدت تلاشِ کلام کے کام آئی۔ مزید برآں اس مجموعے کے چھپواتے وقت جو جو دقتیں پیش آتی رہیں ان کا اعادہ قلم انداز کیا جاتا ہے۔ تمام کاپیاں طبع ہو جانے کے بعد اس کے دیباچے کے لیے مکرمی جناب شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹر پراسیکیوٹر (لائل پور) کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ شیخ صاحب نے لحاظ میں آکر ہاں تو کر لی لیکن آپ کو عدیم الفرصتی کے باعث چند منٹ دینے دشوار ہو گئے۔ آخر کئی ہفتوں کی پیہم یاددہانیوں سے جناب ممدوح نے تمہید عنایت فرمائی۔

الغرض ان تمام ناگزیر وجوہات کی وجہ سے جس قدر اس مجموعۂ نیرنگ کی اشاعت میں تعویق عمل میں آئی ہے اس کے لیے امید ہے کہ وہ تمام باذاق اصحاب جو ایک عرصے سے اس کی اشاعت کے منتظر ہیں مَحَلِّ اَمِیرِ تَرْھُوْنِ بِاُوقَاتِہَا کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں معذور رکھیں گے۔ اَلْعُذْرُ عِنْدَ کِرَامِ النَّاسِ مَقْبُوْلٌ

فضل الٰہی مرغوب مہتمم پروپرائٹر مرغوب ایجنسی

لاہور یکم فروری ۱۹۱۶ء

ؒ "کلام نیرنگ" طبع ثانی کا اختتامیہ۔ اس میں جس تصویر ملحقہ کا ذکر ہے وہ اس مجموعہ کے آغاز میں شامل کی گئی تھی۔

نعرۂ مستانہ[۱]

تو جا بجا ہے تو سو بسو ہے　　تو کو بکو ہے تو مو بمو ہے

ظاہر بھی تو ہے مظہر بھی تو ہے　　ہر سمت اپنے خود رو برو ہے

جلوہ بھی تیرا آنکھیں بھی تیری　　منظور بھی تو ناظر بھی تو ہے

جوئندہ تو ہے یابندہ تو ہے　　مطلوب تو ہے تو جستجو ہے

دار الحرم میں بیت الصنم میں　　تیری طلب میں اک ہاؤ ہو ہے

صحنِ چمن میں جنگل میں بن میں　　تو رنگ و بو ہے نشو و نمو ہے

رمزِ نہاں تو رازِ عیاں تو　　نایاب بھی تو حاصل بھی تو ہے

تو تو کہاں ہے؟ جب میں نہیں ہوں　　جو کچھ ہے سو ہے میں ہوں نہ تو ہے

تیری لگن تھی تو مل گیا جب
تیرنگ کو پھر کیا آرزو ہے

۱؎ یہ نظم "نغمۂ مستانہ" کے عنوان سے رسالہ "نظام المشائخ" دہلی، شمارہ ذوالحجہ ۱۳۳۲ھ میں بھی شائع ہوئی تھی۔ صفحہ ۵۱

جانِ شیریں[1]

ذیل کی نظم کا اندازِ بیان اور طرزِ خیال خود کہہ دے گا کہ انگریزی نغمہ کے چمن سے گل چینی کی گئی ہے۔ سوال وہی ہے جس کو انسان ہمیشہ سے دُہرا رہا ہے اور جس کا جواب اس گنبدِ حیرت میں سوائے ایک گونج کے اور کچھ نہیں ملا۔ ع جانا تو یہی کہ کچھ نہ جانا ہم نے۔ جو کچھ معلوم ہے وہ دوسرے شعر میں ہے۔ باقی ہیک قیاس کی تگ و دو۔ چوتھے بند[2] میں نظریۂ فنا فی الاصل سے تمسک کیا گیا ہے اور پانچویں بند[2] میں مسئلہ تناسخ سے۔ آخر کا بند[2] ناچاری کی تصویر ہے اور ایک آرزوئے محض کا اظہار۔

نیرنگ

اے جانِ عزیز! جانِ شیریں — معلوم نہ ہو سکا تو کیا ہے؟
معلوم ہے بس یہی کہ مجھ سے — ہونا تجھے ایک دن جدا ہے
اچھا بس کوچ کر یہاں سے — یہ بھی نہ بتا کہ کب ہے رحلت
دل میں جب تیرے آئے چل دے — جو تجھ کو پسند آئے ساعت
مت کہہ مجھے اَلفراق! اَلبَین! — دکھلا مت رخِ شامِ غربت
کل صبحِ وطن کو شاد و خنداں — ملنا مجھ سے بصد مسرت

---

[1] یہ نظم مخزن کے شمارہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحہ ۵۱ - ۵۲

[2] سہوِ کتابت سے "شعر" کی بجائے "بند" لکھا ہے۔

انسان کی فریاد[1]

ہاں اے مصافِ ہستی! مت پوچھ مجھ سے کیا ہوں!
اک عرصۂ بلا ہوں! اک لقمۂ فنا ہوں

نے مجھ کو جائے ماندن نے مجھ کو پائے رفتن
میں راندۂ قدر ہوں آوارۂ قضا ہوں

مجبوریوں نے ڈالا گردن میں میری پھندا
خو کردۂ وفا ہوں جاں دادۂ رضا ہوں

جو میری حاجتیں ہیں ساری مصیبتیں ہیں
نکہت کی ابتدا ہوں شامت کی انتہا ہوں

صیاد حادثے کا کرتا ہے میرا پیچھا
مرغِ بریدہ پر ہوں صیدِ شکستہ پا ہوں

ہے ذات میری مجمع ساری برائیوں کا
کہنے کو میں بڑا ہوں لیکن بہت برا ہوں

آزادیوں کی مجھ پر تہمت ہی ہے سراسر
میں قیدیٔ ہوس ہوں میں بندۂ ہوا ہوں

---

[1] یہ نظم "روحِ نظم" مرتبہ تاجور نجیب آبادی و پنڈت میلا رام وفاؔ، جلد اوّل (مطبوعہ لاہور، سنہ ندارد) میں بھی شامل ہے۔ صفحات ۱۰۷ - ۱۰۸

اک بات ہو بتاؤں اِک درد ہو سناؤں
روؤں بھلا کہاں تک کب تک پڑا کراہوں
فریاد کی اجازت مجھ کو نہ تاب و فرصت
ظاہر ہمہ خموشی باطن ہمہ ٹپکا ہوں

کم بخت دل کچھ ایسا میں ساتھ لے کے آیا
اک لمحہ جس کے ہاتھوں دنیا میں سکھ نہ پایا
جو جوش اس میں اُٹھا حالات نے دبایا
جو شعلہ اس میں بھڑکا تقدیر نے بجھایا
امّید کا یہ غنچہ کِھلتے کبھی نہ دیکھا
یہ آرزو کا پودا پھلتا نظر نہ آیا
دِل سے بہت خلائق سو بار اس میں امڈی
ابرِ جنونِ اُلفت سو بار اس میں چھایا
عزمِ رہِ اخوّت ہر اک طرح سے ہٹاتا
فیاضیوں کا بیڑا سو سو طرح اٹھایا
گو اس میں موجزن تھی قوم و وطن کی الفت
لیکن غرض نے اس کو کچھ اور ہی سکھایا
ہوتی نہیں رسائی امّید کے افق تک
طولِ امل نے اس کو اک جال میں پھنسایا

جو آرزو ہے اس کی ناکامی ابد ہے
ارمان اس کا حرماں امید اس کی مایاؔ
پائی نہ دل نے اس نے طاقت بقدرِ ہمت
بے اختیاریوں نے یہ روزِ بد دکھایا

کی رہبرِ خرد نے ہر چند رہنمائی
اس جہد پر بھی لیکن کھلتی نہیں سچائی
پایا نہ میں نے اب تک مقصد کا اپنے ساحل
کی بحرِ معرفت میں دن رات آشنائی
اس جستجو میں میں نے کی سیرِ طور و ایمن
پربت کو گھر بنایا جنگل سے لو لگائی
مندر کو جا کے دیکھا گرجا میں جا کے ڈھونڈا
مسجد کو چھان مارا اس کی نہ دید پائی
جوگی کا روپ دھارا بن میں کیا گزارا
تن پر بھبھوت مل کر دھونی بہت رمائی
جب تپ میں عمر اپنی کی میں نے تیر اکثر
بن بن کے پیر راہب جا خانقہ بسائی
صوفی بھی بن کے دیکھا اور رند بے ریا بھی
کر نعرۂ اَنَا الْحَق اک کھلبلی مچائی

لہ مایا فلسفۂ ویدانت کی اصطلاح میں دھوکے اور سراب کے سے معنے رکھتا ہے (دیر نگ)

پھرتی ہیں ماری ماری مشتاقِ جلوہ آنکھیں
پر اِک جھلک سے بڑھ کر دیتا نہیں دکھائی
بے فائدہ ہے ساری یہ عقل کی تگا پو
تا منزلِ حقیقت ممنوع ہے رسائی

اٹھ جا نظر سے میری ہاں اے حجابِ ہستی
حسنِ ازل نہاں ہے زیرِ نقابِ ہستی
یہ زندگیٔ انساں اِک خواب ہے پریشاں
بیداریٔ عدم ہے تعبیرِ خوابِ ہستی
میں چاہتا ہوں ساقی! نشۂ مے فنا کا
بیگانہ خرد ہے مستِ شرابِ ہستی
طالب ہوں اب سکونِ دنیائے نیستی کا
یہ کشمکش کہاں تک اے اضطرابِ ہستی
دیکھیں اگر تو کیوں کر ہم جلوۂ معارف
تو ظلمتِ نظر ہے اے آفتابِ ہستی
تسکیں کو زہرِ قاتل آب و ہوائے عالم
راحت کا دشمنِ جاں ہر انقلابِ ہستی
یہ میرے دِل کی حالت یہ میری روح کی گت
کہلاؤں کس صفت پر میں انتخابِ ہستی
اے تشنۂ حقیقت دھوکے میں تو نہ آنا
اِک دام پُر خطر ہے موجِ سرابِ ہستی
چاہے اگر رہائی پیش از فنا فنا ہو
یاداشِ جرمِ ہستی ہے یہ عذابِ ہستی

فصلِ بہار

گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
ہر طَیر نغمہ سنج سرِ شاخسار ہے

تڑپے ہے روح سن کے پرندوں کے چہچہے
مستِ مے سرور ہے جو ہوشیار ہے

تیاریوں میں بسکہ ہے قدرت لگی ہوئی
میدان میں تہیّہ صد لالہ زار ہے

سرگرم ہیں جو ایسے ہی قدرت کے کارکن
کل لالہ زار ہو گا جو اب کوہسار ہے

صحرا کو کھینچتی ہے دلِ زار کو امنگ
بیٹھا ہے جو گھر میں یہ کس کو قرار ہے

محسوس کون باغ کی کرتا نہیں کشش
ہے کون دل پہ آج جسے اختیار ہے

نکتہ بڑا لطیف ہے یہ اے رفیقِ سیر
جنگل میں جو درخت کہ بے برگ و بار ہے

نوشاہ ہے کہ بیاہ کے دن ہیں بہت قریب
میلا[1] لباس اس لیے اس کا شعار ہے

---

[1] بعض مقاموں کے رواج کی طرف اشارہ ہے کہ مستورات دولہا کو سہرے کے دن سے کچھ دن پہلے کپڑے بدلنے نہیں دیتیں۔ (نیرنگ)

سہرے کے دن یہ پہنے گا پوشاک مخملی
ہے اس کا بیاہ نام یہ جس کا بہار ہے

مخمل کا فرش باغ میں سبزہ بچھا چکا
اب نو عروسِ گل کا فقط انتظار ہے
کچھ حظ اٹھا لے تو بھی کہ دو دن ہیں سیر کے
ناداں! بہارِ باغ کا کیا اعتبار ہے
منہ موتیوں سے گل کا بھرا ہے بہار نے
جو قطرہ اس کا ہے وہ دُرِ شاہوار ہے
غنچے کھلے ہیں یا ہیں کھلے نافہ ہائے مشک
یہ صحنِ بوستاں ہے کہ ملکِ تتار ہے
تیری ہی لگ نہ جائے نظر اے نگاہِ شوق
تو دیکھتی تو چہرۂ گل کا نکھار ہے
دنیا میں رنج اگر نہیں راحت کے ساتھ ساتھ
لالے کا دل بہار میں کیوں داغدار ہے؟
زاہد بھی مثلِ طفل کرے رقص کیا عجب
جوشِ بہار دشمنِ جانِ وقار ہے
آتا نظر ہے سبزہ ہی سبزہ ہر اک جگہ
تارِ نگاہ کیا ہے زمرد کا تار ہے
پائی ہے وہ طبیعتِ موزوں بہار میں
گاتا ہر اک پرند مثالِ ہزار ہے

لعلِ گل و زمردِ سبزہ ہیں کہ یہ ہے
گُلکِ بہار بسکہ جواہر نگار ہے
دیکھے چمن میں سبزہ و گل جو کوئی کہے
معشوقِ باغ سبزہ خط و گلعذار ہے

ق

ہے موسمِ بہار جنوں خیز بے خودی
جو شے ہے بے قرار ہے بے اختیار ہے
مستی سے جھومتے ہیں شجر کوہ و دشت میں
جوشِ جنوں سے دامنِ گل تار تار ہے
موجِ صبا کو زلفِ حسیناں کہوں نہ کیوں
مُشکِ تتار صحنِ چمن کا غبار ہے

چاندنی رات میں بادل

(ایک دل کش مشاہدے کا فوٹو)

گھرا ہوا ہے سیہ ابر سے فلک پر چاند
کہ یا ہے کھولے ہوئے گیسوے معنبر چاند

سیہ کلف نہیں نقطہ ہے ایک کاجل کا
نظر گزر سے بچاتا ہے روے انور چاند

یہ شیوہ چھپنے کا کس ماہ رو سے سیکھا ہے
نقاب ابر کو کیوں کھینچتا ہے منھ پر چاند

یہ گردِ چاند کے بادل نہیں سفید سفید
ہے دوشِ ناز پہ اوڑھے سفید چادر چاند

بچھے ہی جاتے ہیں بادل بہ شوقِ پامالی
خرامِ ناز میں ہے دلبروں سے بڑھ کر چاند

کسی کا جھانکنا گھونگھٹ سے کیوں نہ یاد آئے
نظر جو آنے لگے ابر سے جھلک کر چاند

ہوں مست کیوں نہ شبِ ماہ میں سب اہلِ نظر
مے سرور کا دیتا ہے بھر کے ساغر چاند

گماں ہوا کہ سیہ اژدھے نے مَن اگلا
چمک اٹھا جو سیہ ابر سے نکل کر چاند
مزے کی آنکھ مچولی ہے برق سے کھلتی
رہے گا کھیل میں مشغول آج شب بھر چاند
مجھے ہے تاب کہاں اس کی دید کی تیرنگ
کبھی کبھی کے دلاتا ہے یاد منظر چاند

تلاشِ محبّت[1]

(ایک بلّی کے بچّے کو دیکھ کر)

اس قدر بے چین کیوں پھرتی ہے اے ننھی سی جاں
شور سے سر پر اٹھا رکھا ہے کیوں سارا مکاں
دودھ پی لے بھوک نے تجھ کو ستایا ہے اگر
وہ دھرا ہے دودھ چھوٹی سی پیالی میں اُدھر
دودھ بھی پیتی نہیں تو؟ خیر لے تیرے لیے
گوشت تھوڑا سا منگا رکھتا ہے یہ بازار سے
گوشت کو بھی تو نہیں چھوتی؟ تو کوئی کیا کرے؟
ہاں! ستایا ہے کہیں سردی کی شدّت نے تجھے
آ رضائی میں تجھے اپنی بٹھا لیتا ہوں میں
آ تجھے سردی کے حملے سے بچا لیتا ہوں میں
پر یہاں بھی بیٹھ کر تجھ کو کہاں آرام ہے؟
تلملانے سے تڑپنے سے یہاں بھی کام ہے
بیٹھ کر گھٹنے پر غُرغُر کرتے لگتی ہے کبھی
سر کو میرے پاؤں پر تو دھرنے لگتی ہے کبھی

---

[1] یہ نظم "روحِ نظم" جلد اوّل، صفحات ۱۰۹ – ۱۱۰ میں بھی شائع ہوئی ہے۔

پیار کرتا ہوں تو اس پر بھی نہیں تجھ کو قرار
ناشکیبائی ہے تیری حرکتوں سے آشکار
کس قدر الفت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!
ہائے کیا حسرت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری!
ہائے اے نادان! اب سمجھا میں تیرا مدّعا
تو تلاشِ مہر و الفت میں ہے آتش زیرِ پا
ڈھونڈھتی پھرتی ہے ہاں وہ گوہر نایاب تو
جس کی ہے انساں کو ہم جنسوں میں ناحق جستجو
تجھ کو تو جس چیز کی ہے ابنِ آدم میں نہیں
بلکہ سچ پوچھے تو موجوداتِ عالم میں نہیں
آئے گا تیری سمجھ میں کس طرح یہ فلسفا
ذوقِ راحت ہے تو پیدا کر دلِ بے مدّعا
ہے تمنائے محبّت ایک نخلِ بے ثمر
آرزوئے مہر و الفت ایک شامِ بے سحر
بلبلِ شیدا ہوائے گل میں صرف نالہ ہے
داغِ مہرِ گل سے دل اس کا برنگِ لالہ ہے
ہے دلِ بلبل میں گل کی سرد مہری کی جلن
کیا خبر اس کو کہ گل کے دل میں ہے کس کی لگن
کس کی فرقت میں گلِ تر اس قدر غمناک ہے
چشمِ پرنم ہے جگر خوں ہے گریباں چاک ہے

چاند پر ناحق فدا کرتا ہے جاں اپنی چکور
چاند کب سنتا ہے اس مہجور کے نالوں کا شور
مسکراہٹ چاند کی ہے اس کے نالوں کا جواب
اس طرف اتنا سکوں اور اس طرف یہ اضطراب
آتشِ الفت ہی برقِ خرمنِ پروانہ ہے
یہ پتنگا بھی اداے شمع کا دیوانہ ہے
گرد پھر پھر کر طوافِ کعبۂ الفت کرے
جان دے اور آتشِ ذوقِ فنا میں جل مرے
شمع کو لیکن نہیں اس کی محبت کی خبر
وہ ذرا اس پر نہیں کرتی عنایت کی نظر
کون سی دھن میں خدا جانے وہ ہے آتش بجاں
کس لیے ہیں گرم آنسو اس کی آنکھوں سے رواں
جب محبّت کا یہ عالم ہے تو کیا اِس کی تلاش؟
کیا تمنائیں کہاں کی آرزو کس کی تلاش؟
عاشق از بے مہریِ یارِ جفا جو شکوہ سنج
یار در فرطِ ہواے دیگرے پامالِ رنج ۱

عالمِ پیری اور یادِ ایام

کیا لطف کے تھے وہ دن ! کیا خوب زمانہ تھا!
طفلی کی وہ سب باتیں کیا پیارا فسانہ تھا
کھلتے تھے مزے سے گل ایام بہاراں میں
اور مست پرندے تھے دورِ سے الحاں میں
اب بھی ہیں چمن میں گل خوش رنگ بھی خوش بو بھی
شوخی بھی ہے سوسن میں نرگس میں ہے جادو بھی
پر آہ عجب پیارے ! وہ گل تھے بنفشہ کے
وہ غنچے تھے کیا تیکھے وہ پھول تھے کیا بانکے!

دنیا میں بہت گھر ہیں اور ایک سے ایک اچھا
پر گھر تھا وہ کیا پیارا ہم جس میں ہوئے پیدا
جب پہلے پہل دیکھا سورج کے اجالے کو
امبر کے ستاروں کو اور چاند کے ہالے کو
غم سے نہ تھی آگاہی فکروں سے فراغت تھی
جنت کی بہاریں تھیں آغوش میں مادر کی
رحمت کا فرشتہ تھی ماں کی نگہِ الفت
اب یاد جسے کر کے روتے ہیں بصد حسرت

ہیں دوست بہت لیکن جو دوست پرانا ہے
جس دوست سے دابستہ طفلی کا زمانہ ہے
ملتا ہے تو ملتا ہے کس جوششِ محبت سے
تعریف جو کرتا ہے تو عین صداقت سے
شہرت کی حقیقت کیا! اک پھول ہے بھڑکیلا
مطلق نہیں بو اس میں گو رنگ ہے چمکیلا
پر دوستی اک گل ہے راحت دہ نظارہ
جو بو میں ہے جاں پرور اور رنگ میں ہے پیارا

عشق اور بھی کرتے ہیں، وہ عشق مرنے کا تھا
سو جان سے جب ہم نے اے پیاری تجھے چاہا
چنگاری کی صورت سے کھلا سچلے اب ہم تم
ہاں وقتِ خزاں آیا مرجھا چلے اب ہم تم
پھل پھول ہمارے ہیں پر خوب تر و تازہ
ہے ان کے بھی چہروں پر طفلی کا وہی غازہ
گو نور نہیں باقی خورشیدِ جوانی کا
ہے ان کے تبسم سے ہر سمت اجالا سا

اگلا جو زمانہ تھا دیسا نہیں آسکتا
دھیان اس کا کبھی دل سے اپنے نہیں جا سکتا

وہ گھر جو پرانا تھا ایسا نہیں گھر کوئی
آرام کی جا ایسی آئی نہ نظر کوئی

ہے باغِ وفا کا گل ہر یارِ کہن اپنا
شاداب رہے یارب! دائم یہ چمن اپنا

دِلبر نہیں دنیا میں بی بی سے کوئی بہتر
دکھ درد کی یہ ساجھی ہر حال میں یہ یاور

خار

تو سمجھتا ہے کہ اس باغ میں بےکار ہوں میں
محض بےکار ہی کیا موجبِ آزار ہوں میں؟
تو نے دیکھا ہے مجھے دیدۂ عبرت سے کبھی؟
قدر پوچھی ہے مری اہلِ بصیرت سے کبھی؟
ملکِ ہستی میں کوئی شے کہیں بےسود بھی ہے؟
جلوۂ حسن کسی چیز میں محدود بھی ہے؟
کلکِ قدرت نے لکھی ہے کوئی شے بےمطلب؟
اس مُسدّس[۱] میں کوئی لفظ بھی ہے بےمطلب؟
نورِ خورشید کا ہر ذرّے میں ہے راز چھپا
موجِ دریا کا ہے ہر قطرے میں انداز چھپا
ایک قانون کے تابع ہیں شجر ہو کہ حجر
ایک سانچے میں ڈھلے ہیں کرۂ خاک و قمر
تو گل و خار میں کرتا ہے تمیزیں قائم
دیکھ اس آئین کو جس سے ہیں یہ چیزیں قائم

۱؎ شش جہت د نیرنگ،

کس جگہ حسن کے آئین کا اظہار نہیں؟
گُل ہی گُل باغِ جہاں میں ہے کہیں خار نہیں

آہ کیا چشمِ مشاہد کی ہے کوتہ نظری!
جس سے مستور مرے حسن کی ہے جلوہ گری

دیکھیے! حسنِ تناسب کا نمونہ ہوں میں
کیا دلآویز ہوں کیا شوخ نکیلا ہوں میں

ہے دل افروز مری نوکِ سناں کی سی چمک
میری تشبیہ پہ اترائے حسینوں کی پلک

رنگ ہر شاخ پہ پاؤ گے نرالا میرا
روپ ہر نخل پہ دیکھو گے انوکھا میرا

نگہِ حسن طلب دیکھے تو رعنا ہوں میں
دل میں ہر رنگ میں ہر روپ میں کھلتا ہوں میں

رونق افروز ہے گل باغ میں زینت کے لیے
میں چمن زار میں ہوں گل کی حفاظت کے لیے

دامنِ اہلِ تطاول میں اٹک جاتا ہوں
دیدۂ حاسدِ گلچیں میں کھٹک جاتا ہوں

نہیں آزار دہی خلق کی شیوہ میرا
پھر بھی گلچیں کی مدارات ہے عہدہ میرا

توڑ لینا گلِ تر کا کوئی انسانی ہے؟
باغ میں یوں ہی تباہی کی ہوا آئی ہے

گل کو وہ اپنی غرض کے لیے برباد کرے
کیوں نہ بندہ عملِ نشترِ فصاد کرے؟
راہ رو سے نہیں صحرا میں کبھی مجھ کو خلش
ہاں اگر بھائے اسے آپ ہی غفلت کی روش
خود ہی مجھ خاک نشیں کو وہ کچل ڈالے اگر
تو کبھی اس کو بتاتا ہوں سلامت کی ڈگر
سیکڑوں مور و ملخ وہ تو کچل دیتا ہے
یوں ہی چٹکی سی کبھی بندہ بھی لے لیتا ہے
اس سے ہے نیند سے رہرو کو جگانا مقصود
قدر ہے خاک نشینوں کی بتانا مقصود
اس سے کیا بڑھ کے کروں کام میں انسانوں کا؟
میں نگہبان ہوں کھیتوں کا خیابانوں کا
یوں مری قدر کو جانے کہ نہ جانے کوئی
میرے احسان کو مانے کہ نہ مانے کوئی

راگ

وقت: بعد غروبِ آفتاب

دُھن: مالکوس

تاکجا رُوحِ فلک پرواز کی درماندگی
تاکجا پابندیٔ دامِ قیودِ عنصری
ہے گراں کانوں پہ غوغائے معاشِ ہست و بُود
لاسئے کیونکر روحِ علوی آشیاں تابِ شنود
دار و گیرِ عرصۂ ہستی سے اکتاتا ہوں میں
زندگی کی کش مکش سے سخت گھبراتا ہوں میں
ہاں ذرا اے راگ! تو میرا پرِ پرواز ہو
رہنمائے جادۂ خلوت سرائے راز ہو
ہاں ترے دیپک کی وہ اگلی سی طاقت ہے کہاں
اس کی آتش خیز عالم سوز قوت ہے کہاں
یہ مرے پندار کے تنکے جلا دے تو سہی
راکھ اس دھوکے کی ٹٹی کو بنا دے تو سہی
کون سے دن کام آئے گا مرے تیرا ملہار
ڈال میری جان پر نیسانِ عرفان کی پھوار
سیر تو اپنے پرستاں کی ذرا مجھ کو کرا
روح پرور جلوہ مجھ کو اپنی پریوں کا دکھا

حسن آمِن کا کبھی چھایا کا تو مجھ کو دکھا
زخم پر دِل کے کبھی ناخن کبھی مرہم لگا
سوہنی کی اور گوجری کی ادائیں ہیں غضب
جن سے امڈیں دِل میں اک اندازسے دردِ طرب
درد و شیرینی کی مورت پیاری البیلی پری
دل کی تسکیں دل کی آفت بھولی بھالی بھیروی
دلبرِ محشر ادا تو ڑی ہے انساں کے لیے
جس کی ایک اک تان نشتر ہے رگِ جاں کے لیے
ہے غرض وہ تیس پریوں کا جو تیرا جھگھٹا
باری باری سے مجھے سب کے کرشمے تو دکھا
آ ہر اک گوشے سے اس عالم کے میرے کان میں
ہاں سما جا ایک جادو بن کے میری جان میں
تار تارِ سازِ ہستی سے سنائی دے مجھے
ذرہ ذرہ ایک ارگن سا دکھائی دے مجھے
ہاں وہی سُر بربطِ افلاک کے مجھ کو سنا
جن سے فیثا غورسِ یوناں ترا مفتوں ہوا
ہاں وہ مستی دے کہ ہوشیاریاں جس پر فدا
وہ تڑپ دے سیکڑوں تسکینِ جاں جس پر فدا

---

۱ اہلِ ہند کی موسیقی میں چھ راگوں میں سے ہر ایک راگ کے متعلق پانچ راگنیاں بھی جاتی ہیں۔ اس سے کل تیس راگنیاں ہوئیں۔ آگے ان راگنیوں کی اولاد بے شمار مشہور ہے۔ تیس پریوں سے بھی تیس راگنیاں مراد ہیں۔ (نیرنگ)

تو کلیم دل کو میرے رہنما تے طور ہے
روح کی معراج کو تو اک براقِ نور ہے
تو دلِ انساں کا اک آہنگِ حسرت مند ہے
اس کی ناکامی کی فریادِ ابد پیوند ہے
درد ہے تجھ میں رچا اس واسطے شیریں ہے تو
جس قدر شیریں ہے تو اتنا ہی درد آگیں ہے تو
کس لیے ہے دل نشیں ایسی تری میٹھی صدا
ہے مگر تو منزلِ مقصود کی بانگ[1] درا ؟
تجھ کو سنتا ہر جگہ عالم میں گوشِ ہوش ہے
صوت میں گویا ہے موجِ رنگ میں خاموش ہے
نظمِ موجودات میں ترتیب تیرا قانونِ حسن
روئے محسوسات میں جلوہ ترا افسونِ حسن
رشتۂ ہستی کے پھندے سے چھڑا لے تو مجھے
اپنے آہنگِ طرب زا میں ملا لے تو مجھے

---

[1] حضرت لسان الغیب فرماتے ہیں:

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا ست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

نیرنگِ شفق

کھلا ہے گلشنِ مغرب میں لالہ زارِ شفق
زبس ہے رو کشِ صحنِ چمن بہارِ شفق

ہوا ہے واردِ مغرب جو خسروِ خاور
بنا ہے اس کے لیے قصرِ زر نگارِ شفق

وفورِ نشہ سے چہرے پہ چھا گئی سُرخی
پیے ہے مے قدحِ خور میں بادہ خوارِ شفق

نگاہِ شوق کی گرمی سے جھینپ جاتی ہے
حیا کے جوش سے ہے سُرخیٔ عذارِ شفق

شمارِ لالہ رخوں میں ہوا ہے پارۂ ابر
چرا لیا ہے جو کچھ غازۂ عذارِ شفق

دیا ہے ابر کو اک دھوپ چھاؤں کا خلعت
لگا جو بانٹنے انعام تاجدارِ شفق

اسی کے شوق میں دن بھر سفر میں تھا خورشید
ہوا ہے کیا ہی محبت سے ہمکنارِ شفق

ستارے دیکھ شفق میں گماں گزرتا ہے
کھلا میانِ سمن زار، لالہ زارِ شفق

شفق کے گرد ستاروں کا یہ ہجوم نہیں
دُرِّ یتیم کرے ہے فلک نثارِ شفق

خمِ فلک کو مئے لالہ گوں سے پُر کر کے
قدح کشی میں ہے مصروف بادہ خوارِ شفق

برنگِ شاخِ ثمر در سدا ہے سر بہ زمیں
ہے ایسے حسن پہ اس درجہ انکسارِ شفق

ادب سے سر بہ زمیں ہو کے دل لبھاتی ہے
غرورِ حسن سے بڑھ کر ہے انکسارِ شفق

یقیں دلاتی ہے اِک ماہرو کے ملنے کا
بہارِ گلشنِ امید ہے بہارِ شفق

جواب چرخ کو سوجھا ہے قصرِ حمرا کا
زمیں کے گرد کھنچا ہے جو یہ حصارِ شفق

سے شفق کے وہ چھاتے ہیں میری نظروں میں
کہ میرا تارِ نظر تک بنا ہے تارِ شفق

لکھی یہ تو نے وہ رنگیں غزل کہ اے نیرنگ
ہر ایک شعر ہے گلگونۂ عذارِ شفق

بھونرا

بھونرا لو بھی پھول کا کلی کلی رس لے

(ہندی دوہرا)

طائرِ خوش[1] خبر ہے نام مرا
الفتِ حسن ہے پیام مرا
میری بستی ہے پھول کی خوشبو
غنچہ و گل کی دید کام مرا
وادیِ کوہ سیرگاہ مری
باغ مسکن ہے صبح و شام مرا
نہیں کس گل سے رسم و راہ مری؟
سب پہ پھیلا ہوا ہے دام مرا
پھول پھولے نہیں سماتے ہیں
مسکراتے ہیں سن کے نام مرا
جتنے یہ کج کلاہ غنچے ہیں
جھک کے لیتے ہیں سب سلام مرا

---

[1] ذوق: بلا سے ہوئے مرا مرغِ نامہ بر بھونرا
کہ اس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوش خبر تو ہے
(نیرنگ)

مانتے ہیں صنوبر و شمشاد
سروِ آزاد ہے غلام مرا
بادۂ انس کا نشہ ہے مجھے
مئے الفت سے پُر ہے جام مرا
حسن کو ڈھونڈھتا ہوں ہر گل میں
ذوقِ دید اس قدر ہے عام مرا

جستجوئے گل است ہستیٔ من
ہوشیاری شعارِ مستیٔ من

شاہدِ گل کا حسنِ جاں پرور
کوئی دیکھے گا مجھ سے کیا بڑھ کر؟
ابھی اس کے جمالِ رعنا تک
نہیں پہنچی نگاہِ ذوقِ نظر
ابھی اس بھینی بھینی خوشبو سے
نہیں مہکا مشامِ بادِ سحر
ابھی اس پیارے پیارے چہرے کو
نہیں دھویا ہے اوس نے آکر
اس کی شہرت کا چار سو پیغام
نہیں لے کر گئی نسیم سحر
حال پر عندلیب نالاں کے
نہیں کی اس نے مسکرا کے نظر

اس دلآویز حسنِ زیبا کی
نہیں گلچیں کو خواب میں بھی خبر
میں ہوں اس حال میں بھی گل سے قریں
ہیں عنایات اس قدر مجھ پہ
ہم نفس ہوں انیس و محرم ہوں
میری الفت میں اس قدر ہے اثر
حجلہ آراستے خلوتستم من
بزم پیراستے جلوتستم من
دادِ گل گشت دے رہا ہوں میں
محوِ ہر رنگ و ہر ادا ہوں میں
پیار کرتا ہوں جا کے گیندے کو
منھ بنفشے کا چومتا ہوں میں
آنکھ نرگس سے جب لڑاتا ہوں
مائلِ چشمِ فتنہ زا ہوں میں
لگ چلا ہنس کے سیوتی سے کبھی
کبھی چنپا سے جا ملا ہوں میں
کبھی جوہی سے چھیڑ کر بیٹھا
دل لگی میں کوئی بلا ہوں میں
یاسمن سے ہے میری سرگوشی
موتیا سے سخن سرا ہوں میں

ہے نسیمِ سحر سے یارانہ
رازدارِ دلِ صبا ہوں میں
دل دکھاتا نہیں کسی کا کبھی
رہروِ جادۂ صفا ہوں میں
سرِّ خذ ما صفا سے واقف ہوں
علمِ دع ما کدر پڑھا ہوں میں

دلم از نورِ مہر معمور است
رسمِ بیگانگی ز من دور است

فنِ نظارہ میں ہوں میں یکتا
سب کو لازم ہے اقتدا میرا
مجھ سے اہلِ نظر یہ گُر سیکھیں
میں ہوں ذوقِ سلیم کا پتلا
حسن سے مجھ کو ہے لگاؤ مگر
دل کسی پھول کو نہیں دیتا
روگ دل کو نہیں لگاتا میں
گو مئے شوق کا ہوں متوالا
میرا مطلوب ہر جگہ موجود
میرا محبوب ہر طرف پیدا
نہیں میرا، مثالِ بلبلِ زار
شیوۂ کار جھینکنا روتا

گل کو نفرت نہیں دلاتا میں
شوق اپنا جتا کے حد سے سوا
نہیں میں زید و عمرو کا پابند
میں مقید ہوں دامِ الفت کا
ہے ہر اک گل نگاہ میں میری
شوخ سے شوخ سادہ سے سادا

در تصور چہ انجمن دارم
جلوۂ گل چمن چمن دارم

مرجھایا ہُوا پھُول

(۱)

ہے عجب عالم فضا سے باغ پر آیا ہوا
ہر طرف تصویر کا سا ہے سماں چھایا ہوا
جس شجر کو دیکھیے تنتا ہے اپنے حسن پر
پھول جو دیکھو جوانی پر ہے اترایا ہوا
سیدھے منھ سے بات تک کرتے نہیں غنچے ذرا
ان کا نخرا آج کل زوروں پہ ہے آیا ہوا
دیکھیے موجِ صبا کو کچھ اکڑسی ہے اکڑ
کہتی ہے سارا جہاں ہے میرا مہکایا ہوا
پھنس ہی جاتی ہے نظر اس کی کشش کے دام میں
شاہدِ گُل کا عجب جوبن ہے گدرایا ہوا
یہ سماں ہے، دیکھتا ہوں پر اسی گلزار میں
اک طرف کو شاخ پر اِک پھول مرجھایا ہوا
اس بھلے پھُولے چمن میں یہ گُل پژمردہ ہے
یا کوئی حسرت کا پتلا عاشقِ دِل مردہ ہے

(۲)

کل اسی گُل کا عجب انداز تھا طرفہ نکھار
تھی محبت سے لیے آغوش میں اس کو بہار

لیتی تھی اس کی بلائیں گرد پھر پھر کر نسیم
پھینکتی تھی اوس موتی اس کے سر پر وار وار
چاندنا سا مسکراہٹ سے تھا اس کی چار سو
تھیں ہوائیں اس کے دم سے مشک بیز و عطر بار
کس کے دل میں چٹکیاں لیتی نہ تھی اس کی ادا
دیکھ کر صورت کو اس کی کس کو آتا تھا نہ پیار
ونڈیوں کی طرح جھلتی تھی اسے پنکھا صبا
سر پہ چھتری اس کے تھا کھولے ہوئے ابرِ بہار
ناز پروردِ عناصر تھا بجا کہنا اسے
دیکھ کر اس کو نہیں پھولی سماتی تھی بہار
دیکھ پاتا تھا ذرا اس کو جو کوئی گل عذار
چاہتا تھا جھٹ گلے کا اپنے کر لے اس کو ہار

(۳)

نام کو اس کی ہنسی میں تھا نہ غم کا شائبہ
کیا خبر تھی جلد اڑ جانے کو ہے رنگِ بقا
تھا رگوں میں اس کی گویا موجزن آبِ حیات
اس کو کیا معلوم تھا چلنے کو ہے بادِ فنا
گود میں بادِ بہاری نے کھلایا تھا اسے
چومتی تھی اس کا ماتھا پیار سے بادِ صبا
کی جو کچھ بادِ سحر نے اس سے آ کر چھیڑ چھاڑ
گدگدانے سے یہ اس کے کھل کھلا کر ہنس پڑا

کچھ ہوا اٹھکیلیوں سے اس کی ایسا خندہ زن
ہنستے ہنستے آنکھ میں شبنم کا آنسو آ گیا
چومتی تھیں اس کا منھ جھک جھک کے شاخیں بار بار
اونگھتے کو ٹھیلنے کا اک بہانہ تھی صبا
اس کی بُو کی باندھتی تھی کل ہوا موجِ نسیم
انقلاب آیا ہے لیکن آج یہ کتنا عظیم

(۴)

جانتی تھی کل اسے جو شاخ اپنا تاجِ سر
آج ہے اس کے لیے یہ بارِ خاطر سے بتر
درد سے اس کے نہیں بھرتی ہے ٹھنڈی سانس تک
سرد مہر ایسی ہوتی ہے آج تو بادِ سحر
ڈھونڈھتی تھی کل بہانے اس سے لگ چلنے کے تو
آج کترانے لگی ہے اس سے تو کیوں اس قدر؟
آج آنکھیں پھیر لیں گلچیں نے گر اس سے تو کیا
رال اس کی بھی ٹپکتی تھی اسے کل دیکھ کر
اپنے اپنے حال میں ہیں مست سکانِ چمن
کس کو پروا ہے کرے جو اس کی حالت پر نظر
کل گُلِ تر تھا، تو تھا گلگونہ رُوئے سخن
صرفِ تشبیہ عذارِ مہوشانِ سیمبر
اب زبانِ شعر میں ہم معنیٔ حسرت ہے یہ
اہلِ بینش کو چراغِ دیدۂ عبرت ہے یہ

(۵)

اے تماشائی! مزے سیرِ چمن کے لوٹ کر
اس گلِ پژمردہ کی جانب ذرا کرنا نظر
یہ دکھاتا ہے اگر ہوں عقل کی آنکھیں کھلی
کوئی دن کے ہیں سب اس دنیا کے حُسنِ کرّ و فر
ہوش کے کانوں سے سن یہ کہہ رہا ہے صاف صاف
اس دو روزہ زندگی کو اس طرح کر تو بسر
چار سو پھیلے جہاں میں بُو ترے اخلاق کی
دیکھ کر تجھ کو دلوں سے دور ہو غم کا اثر
کاٹ دے ہنس کھیل کر اس مختصر ہستی کو تو
دے خوشی سب کے دلوں کو ورنہ مت پہنچا ضرر
کل کو چھا جائے نہ اُن پہ موت کی پژمردگی
التفاتِ دوستاں کی آج ناداں قدر کر
ہے مری پژمردگی تاویلِ رسیاتِ حیات
میری ایک اک پنکھڑی تفسیرِ آئینِ ممات

خوابِ یتیم

شفقت ہیئتِ انسان میں پھر آئی نظر
بن گیا پیکرِ محسوس خیالِ مادر
چار آنکھیں ہوئیں پھر پیار بھری آنکھوں سے
پھر محبت نے لیے آکے جبیں کے بوسے
پھر وہ آغوش کہ کہیے اسے فردوسِ زمیں
وہی آغوش مکاں اس کا بنا اور یہ مکیں
بے کسی چھٹ گئی اِک گوشۂ انساں میں دبک
دل سے جاتی رہی اندوہ کے کانٹے کی کھٹک
کچھ نرالی ہی تھی ان پیار کی نظروں کی چمک
عالمِ روح کی آتی تھی نظر اُن میں جھلک
پیار سے اس کے امنڈتی تھی خوشی وہ دل میں
کہ نہیں ملتی کہیں عالمِ آب و گِل میں
آگئی جب کہ نظر شکل وہی جس کے لیے
سیکڑوں آہیں کھچیں اشک ہزاروں ہی بہے
کس مپرسی کی لگا کرنے شکایت اس سے
خستہ حالی کی لگا کہنے حکایت اس سے

ماں نے الفت سے بھرے لفظ تسلی کے کہے
اس کو سینے سے لگا پیار سے آنسو پونچھے

بل بے نیرنگیٔ اُمید کہ آتی ہے نظر
اسی عالم میں ذرا دور پہ تصویرِ پدر
خواب ہے یا کہ حقیقت ہے یہ معلوم نہیں!
دل کو اس بخت کی بیداری کا ہو کیسے یقیں!
چل گیا اشک پہ اُمید کا آخر افسوں
باپ سے جا کے لپٹ ہی گیا یہ زار و زبوں
پھر ہوا تجربۂ راحتِ آغوشِ پدر
رو کے لانے لگا یوں حرفِ شکایت لب پر
تم نے ابا ہمیں مدت سے نہیں پیار کیا
نہ کھلونا کوئی بازار سے ہے لا کے دیا
گھر میں سب کہتے تھے تم جلدی سے آ جاؤ گے
اور شیرینی مرے واسطے تم لاؤ گے
تم نہیں آئے یہ دن آ گئے رستہ تکتے
چھپ گئی آنکھوں سے اماں بھی تمہارے پیچھے
سب چھپاتے رہے تم دونوں کا جانا مجھ سے
کھیلتے کھیلتے کہہ دیتے تھے لیکن لڑکے
مر چکے ہیں ترے ماں باپ تجھے دھیان ہے کیا
یوں ہی لوگوں کے تو کہنے پہ نہ کھانا دھوکا

شک بھی تھا دل میں مرے ساتھ ہی امید بھی تھی
اس تذبذب میں پڑی سخت مصیبت جھیلی
دیکھتا تھا میں جدھر سارا جہاں تھا ویراں
کوئی دنیا میں نہ تھا حال کا میرے پرساں

باپ نے سینے سے لپٹا کے اسے پیار کیا
اک تر و تازہ اسے خوشۂ انگور دیا
جوں ہی لڑکے نے وہ انگور زباں پر رکھے
ذائقہ آم کا انگور میں پایا اس نے
خوابِ غفلت سے تحیّر نے جگایا شک کو
کہ یہ تصویرِ دلآویز کہیں خواب نہ ہو
شک کے آتے ہی دگرگوں لگی ہونے حالت
لطفِ منظر سے لگا مانگنے فوراً رخصت
باپ کے رخ پہ نظر آئے تغیّر کے نشاں
ماں کی صورت پہ گزرنے لگا دھوکے کا گماں
شک نے پامال کیا لطفِ نظر ہائے غضب
خاک میں مل گئے امید کے منصوبے سب
شک نے حجت یہ اٹھائی کہ اسے خواب کہے
زورِ امید نے مارا کہ حقیقت سمجھے
کش مکش سینے میں امید نے کچھ کی جو ادھر
ہاتھ لپکا کے پکڑنے لگا دامانِ پدر

ماں کی تصویر جو بھی دھندلی سی ہوتی جاتی
سعی کی دامِ تصوّر میں اسے کھینچنے کی
بامِ مقصد پہ نہ پہنچی جو تصوّر کی کمند
ہو کے مایوس لگا رونے بآوازِ بلند

اپنے ہی رونے کی آواز سے وہ چونک اٹھا
دِل پہ عالم تھا مگر اس کے عجب حیرت کا
نیست اور ہست میں کچھ فرق نہ کر سکتا تھا
دِل میں جذبات نے طوفان اٹھا رکھا تھا
بے دِلی کا تھا یہ عالم کہ نہ امید نہ یاس
ان کے ان لفظوں سے کر لیجیے حال اس کا قیاس
"خواب تھا یا کہ حقیقت یہ پدر اور مادر!
ماں کے کیا معنی ہیں! کس چیز کو کہتے ہیں پدر
کچھ کہے کوئی یقیں مجھ کو نہیں آسکتا
کہ میں اس دہر میں ماں باپ کبھی رکھتا تھا"

راحتِ یاس

دم ناک میں کیا تھا طوفانِ غم نے میرا
ٹکڑے جگر کیا تھا حسرت کے سم نے میرا
خرمن جلا دیا تھا برقِ الم نے میرا
میں جان دے چکا تھا تو نے مجھے جلایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا سبز باغ برسوں امید نے دکھائے
جھوٹے وعدے اس کے جھوٹے سب میں نے آزمائے
دمبازیوں سے اس کی دھوکے بہت سے کھائے
پھندے سے اس کے تو نے آخر مجھے چھڑایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

امید کے وہ وعدے جھوٹی ہوائیاں تھیں
سب جو فروشیاں تھیں گندم نمائیاں تھیں
دن رات کوششیں تھیں اور نارسائیاں تھیں
دھوکے کا تو نے پردہ آخر کو آ اٹھایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا آرزو کی تپ تھی کیا شوق کا جنوں تھا
تن من جلا رہا تھا کیا شعلۂ دروں تھا

حرماں کے نشتروں سے دل تھا کہ غرقِ خوں تھا
زخموں پہ جاں کے تو نے مرہم سا آ لگایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا آہِ سرد تو نے ٹھنڈی ہوا چلائی
گہری سی نیند جس سے دردِ دروں کو آئی
کیا یاس تو نے میٹھی لوری اُسے سنائی
کیا بھیرویں کی دُھن میں یہ تو نے گنگنایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

کیا سکھ کی زندگی ہے اب شوق ہے نہ حسرت
نے آرزو نہ حرماں دونوں پہ بھیجو لعنت
اے یاس تجھ کو شاباش اے یاس تجھ پہ رحمت
امید دور ہو چل تو نے بہت ستایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

گزرے گی خوب اپنی اب میں ہوں اور تو ہے
تجھ کو ہے مجھ سے اُلفت یاں تیری جستجو ہے
میں جسم ہوں تو جاں ہے میں پھول ہوں تو بُو ہے
صد شکر ہے خدا نے مجھ سے تجھے ملایا
اے یاس تیرے صدقے تو نے مجھے بچایا

ایک آنسو سے دو دو باتیں

اے اشک! تو عجیب ہے! طرفہ ہیں تیرے کام
دکھوں نہ کیوں "بلاغتِ خاموشی" تیرا نام

جو بے زباں ہے درد سے اس کی زباں ہے تو
جو قابلِ بیاں نہیں ان کا بیاں ہے تو

ہو جوشِ دل نے جس کی زباں کو جکڑ دیا
کون اس کی معذرت میں ہو گویا ترے سوا

عاشق کے دل میں جتنے ہیں ارماں بھرے ہوئے
تیرے سوا ہے کون جو دلبر سے کہہ سکے

جب دیکھتی ہے روح کوئی رازِ کائنات
یا رنگِ بے ثباتیِ ہنگامۂ حیات

اس کیفیت کو کہہ نہیں سکتی کبھی زباں
تیرے ہی لب سے ہوتے ہیں جذبے وہ سب بیاں

جس کو پناہ دہر میں ملتی نہیں کہیں
ہوتا ہے تیرے در پہ وہ آکر پناہ گزیں

دنیا میں جن کا کوئی نہیں غم گسار ہے
تو ایسے بے کسوں کا دل و جاں سے یار ہے

فریاد جس غریب کی سنتا نہیں کوئی
اس کی اپیل کی تو عدالت ہے آخری

افشائے رازِ عشق کا کھٹکا سا ہے تجھے
سازش ہے تیری آہ سے اور رنگ زرد سے
ہمدردیٔ انام کا رکھتیں صدف جو نام
تو اس صدف کا گوہرِ یکتا ہے لاکلام
چھا جائے دِل پہ جب کوئی غم ابر کی صفت
اِک تو ہے سچے دل سے جو کرتا ہے تعزیت
ہوتا ہے سنگِ راہِ دِل باصفا بھی تو
بنتا ہے یعنی برقعِ اہلِ ریا بھی تو
وہ نیک لوگ ہوتے ہیں جو راہیٔ فنا
تو بہتریں قصیدہ ہے ایسوں کی مدح کا
پنجے میں جب عدو کے جہانگیر پھنس گیا
اور حکمِ قتلِ نورجہاں صاف لکھ چکا
تو ہی تھا جس نے نورجہاں کو بچا لیا
اس دم بلا کو ٹالنا تیرا ہی کام تھا
زنجیرِ عشق سے جو ہوں دو دِل بندھے ہوئے
گر فرق ان میں آئے کسی اتفاق سے
ایسے دلوں کی صلح کرانا ہے تیرا کام
بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانا ہے تیرا کام
معشوق کی جو آنکھ کو کرتا ہے تو پُرآب
عاشق کی بدگمانی کا ہے بہتریں جواب

بھر لائے آنکھ میں تجھے جب کوئی مدعا
سمجھے نہ کس کا دِل تجھے اک وعدۂ وفا

ہوتا ہے قصرِ دِل میں جو واردِ خیالِ یار
دِل اس پہ تجھ کو کرتا ہے مثلِ گہر نثار

تو چشمِ دل ہے! آمدِ دلبر کی سن خبر
کرتا نظر ہے آنکھ کی کھڑکی سے جھانک کر

وہ آنکھ جس میں ہوتا ہے تو جلوہ گر ذرا
انساں کی حسرتوں کا ہے جامِ جہاں نما

قطرہ ہے پر تعمقِ دریا نما ہے تو
پیمانہ بحرِ روح کی گہرائی کا ہے تو

اے اشک! تیرے وصف تو سب ٹھیک ہیں مگر
نیرنگؔ کو بھی کاش دکھائے تو کچھ اثر

خوابِ ناز

ہاں نگاہِ شوق! آ دکھلائیں اِک پیارا سماں
پاک نظارہ ہے آنا پاک دِل سے تو بھی یاں
تو بنے گلچیں تو یہ ہے ایک طرفہ بوستاں
شائقِ گلگشت جس کا ہو دلِ روحانیاں

حُسن کا اس دم عجب عالم فریب انداز ہے
وہ بہارِ باغِ خوبی محوِ خوابِ ناز ہے

اس گھڑی آرام میں ہیں وہ نظر کی بجلیاں
چلبلی وہ مسکراہٹ وہ پیا پے شوخیاں
جاگتا ہے ایک بھولا پن مثالِ پاسباں
پیلے چہرے پر ہے چھایا ہائے کیا پیارا سماں

گر فرشتے بھی یہ بھولی بھولی صورت دیکھ پائیں
اپنے معصومی کے دعوے سے یقیں ہے ہاتھ اٹھائیں

روح پر کرتا ہے یہ منظر عجب دِل کش اثر
جس طرف کو آنکھ اٹھاؤ چاندنی ہے جلوہ گر

یہ نظم "تصویر جذبات"، جلد اوّل، مرتبہ تاجور نجیب آبادی (مطبوعہ لاہور، سن ندارد) صفحات ۵۱، ۵۲ میں بھی شائع ہوئی ہے۔ لیکن اس کا پہلا بند اس میں شامل نہیں ہے۔

منعکس ہوتا ہے اس چہرے سے کیا نورِ قمر
چاندنی کی ہر کرن ہے ایک الفت کی نظر

چاند بھی گویا کہ اس جلوے سے محوِ دید ہے
ہاں مبارک ہو نگاہِ شوق تیری عید ہے

ہے غرورِ حسن کی اس سادگی میں بھی جھلک
ہر شعاعِ حسن میں ہے برقِ خاطف کی چمک
نشترِ جاں ہے سکوں میں بھی ہر اک بانکی پلک
اضطراب افزا ہے گھونگھر والے بالوں کی مہک

ابروئے پیوستہ میں عشوہ ہے گو دزدیدہ ہے
مسکراہٹ ہے لبوں پر اب بھی گو خوابیدہ ہے

ہیں ہم آہنگِ خموشی غمزہ و ناز و ادا
دیدۂ مشتاق ہے آئینہ ساں حیرت زدہ
اس چمن کی دل فریبی کی نہیں کچھ انتہا
اے نگاہِ شوق بس گلگشت اس کی تا کجا

یہ نہ ہو ارمان کی بے تابیاں ہونے لگیں
جاگ اٹھیں وہ تو تجھ سے بدگماں ہونے لگیں

بادل

میں بھی اے ابر ترے حسن کا شیدائی ہوں
تیری نیرنگی کا دیرینہ تماشائی ہوں
میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکر ہے بینائی کا
اس قدر روپ انوکھے جو دکھائے تو نے
سچ بتا کس سے یہ انداز اڑائے تو نے
کبھی ہیبت بھری صورت تو بنا لاتا ہے
بن کے اک موہنی مورت تو کبھی آتا ہے
دل سے مجھ کو یہ تری عشوہ گری بھائی ہے
یہ ادا تجھ کو اسی شوخ نے سکھلائی ہے
چاندنی رات میں وہ ناز سے آنا تیرا
بن کے اک نور کا پتلا وہ دکھانا تیرا

لہ شیخ ناسخ علیہ الرحمۃ کا شعر ایک لفظ بدل کر جڑ دیا گیا ہے، دنیرنگ،
اصل شعر یوں ہے،

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا
کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا

(مرتب)

چاند کو پیار سے سینے سے لگانا تیرا
اور کبھی دور اسے چھوڑ کے جانا تیرا
چاند کے حسن پہ کیا دل ہے ترا آیا ہوا
ہالہ کہتے ہیں جسے یہ تری آغوش ہے کیا؟
دل لگی چاند سے تیری یہ مجھے بھاتی ہے
گو مری یاد کو بے چین یہ کر جاتی ہے

لطف رکھتا ہے گرج کر یہ برسنا تیرا
ہے یہ انداز نمائے غضب و رحم خدا
چشم معنی کو بہت کچھ نظر آیا اس میں
کچھ گیا یسر مع العسر کا نقشا اس میں

جب کہ جل جائے تمازت سے زمیں کا سینہ
حکمت آمیز ہے تھم تھم کے برسنا تیرا
پیاس کی آگ کو جس طرح بجھائے کوئی
جرعہ جرعہ کسی پیاسے کو پلائے کوئی

جلوۂ برق تری موجِ تبسم تو نہ ہو؟
نعرۂ رعد ترا شورِ ترنم تو نہ ہو؟
ہائے البیلی یہ رفتار یہ بے ساختہ پن
منعکس تیری اداؤں سے ہے حسینوں کا چلن
بے سبب کب یہ ترا جھوم کے یوں آنا ہے
تو کسی ناز کے متوالے کا مستانہ ہے

تیرا اندازِ دلآویز جو اِس کو بھایا
ہار گردن میں تری قوسِ قزح نے ڈالا
گُل کھلاتی ہے تری آڑ میں سورج کی کرن
کیسے رنگوں کے دکھاتی ہے دلآویز چمن
تیرے صدقے سے ہے گُل کارِ شفق کی شہرت
تیرے چہرے پہ دکھاتا ہے وہ اپنی صنعت
تیری مشاطہ ہیں دو، نورِ سحر رنگِ شفق
تو ہے آئینۂ نیرنگیٔ حسنِ مطلق
شاہدِ حسنِ ازل کا ہے تو بُرقع بے شک
تجھ میں آتی ہے نظر اس رُخِ روشن کی جھلک
ڈال کر اپنے دلِ زار کی حالت پہ نظر
رشک آتا ہے مجھے تیری سبک باری پر
مخمصوں سے نہ غرض تجھ کو نہ غم کی پروا
کام تیرا ہے ہواؤں سے کلیلیں کرنا
دردِ پنہاں سے نہیں اشک بہانے تجھ کو
وسوسے کاہے کو آتے ہیں ستانے تجھ کو
پڑے پالا کبھی کیوں خوف و رجا سے تجھ کو
ہے اگر کام تو ہے صدق و صفا سے تجھ کو
کب تلک دیکھیے تجھ کو نگہ حسرت سے
کاش میں تجھ میں پہنچ جاؤں کسی صورت سے
کسی ترکیب سے دنیا سے اٹھا لے اے ابر!
اپنے نیرنگ کو اپنے میں ملا لے اے ابر!

حسن و عشق

عشق نے تنگ آ کے آخر حسن سے اِک دن کہا
"دیکھ اے پیارے! نہیں اچھے ترے جور و جفا
گرم ہفت اقلیم میں بازار تیرا مجھ سے ہے
تیری عزت مجھ سے ہے تیرا بول بالا مجھ سے ہے
میں نہ ہوں تو میری جاں! تیری حقیقت کچھ نہیں
جب کوئی گاہک نہ ہو موتی کی قیمت کچھ نہیں
اس پہ میرے ساتھ تیری کج ادائی ہے غضب
یہ تغافل ہے ستم بے اعتنائی ہے غضب
چھوڑ اس ٹیڑھی ڈگر کو لے وفا کا راستہ
ورنہ پیارے اپنی ان باتوں کو تو پچھتائے گا
بے وفائی میں اگر تجھ سے کروں تیری صفت
خاک میں مِل جائے تیری ساری قدر و منزلت"

حسن نے جس وقت یہ تقریرِ برجستہ سنی
عشق پر ترچھی نظر کی ناز و نخوت سے بھری
بولا "اپنی اصل کی شاید نہیں تجھ کو خبر
صفحۂ ہستی پہ تو ہے میرے دم سے جلوہ گر

میں اگر ہوتا نہ اے ناداں تو تو ہوتا کہاں
میں اگر معدوم ہو جاؤں تو تو ہے بے نشاں

آہ و اشکِ غم ہوا و آب و دانہ ہے ترا
یہ مرے انعام ہیں ان پہ گزارا ہے ترا

دل پہ کیوں احساں فراموشی کا ڈالا پردہ ہے
تو جہاں میں میرا آوردہ نمک پروردہ ہے"

عقل نے نیرنگ! یہ ترکی بہ ترکی جب سنی
یہ کہا، اور ہم سے سچ پوچھو تو دل لگتی کہی

"عشق کا ممکن ہے کیونکر حسن سے ہونا جدا
عکس ہے آئینۂ ہستی میں یہ تو حسن کا

حسن اک سورج ہے اور ہے عشق اس سورج کا نور
کس طرح ممکن ہے ہونا نور کا سورج سے دور

عالمِ ہستی میں دونوں لازم و ملزوم ہیں
ہیں تو دونوں ہیں نہیں تو دونوں ہی معدوم ہیں"

کسی کا دھیان

آ دِل میں! میں نثار ترے اے کسی کے دھیان
اس روح کی تو روح ہے اس جان کی ہے جان

تو جلوۂ نہاں ہے کسی کے جمال کا
اے سیکڑوں دلوں کی خوشی! تجھ پہ میں فدا

سونا پڑا ہے دل کا شبستاں ترے بغیر
کیسے بسے یہ خانۂ ویراں ترے بغیر؟

ہے انتظار حسرتِ دیدار کو ترا
ارمان تک رہے ہیں تری راہ جلد آ

تو شمع ہے خیال کے فانوس کے لیے
روشن چراغِ فکر ہے تیرے ہی نور سے

ذرّہ صفت ہے واہمہ تو مہرِ خاوری
اس کی فسوں گری ہے تری ذرّہ پروری

دیدارِ یار جامِ شرابِ طہور ہے
تو اس سے لطیف کا پیارا سرور ہے

دوری تری جدائیِ جاناں سے کم نہیں
تو ہو تو مجھ کو یار کی فرقت کا غم نہیں

اس دِل کا غم بھی تو ہی ہے اور غم گسار بھی
اس کی تڑپ بھی تو ہی ہے اس کا قرار بھی

خلوت کا تو انیس ہے جلوت کا تو رفیق
ہر حال میں تو ساتھ ہے اے باوفا شفیق

کیا تجھ سے نوک جھوک ہے کیا چھیڑ چھاڑ ہے
ہے صلح بھی تجھی سے تجھی سے بگاڑ ہے

ہاں تیرے روٹھنے میں منانے میں لطف ہے
اس دل لگی میں ہنسنے ہنسانے میں لطف ہے

اپنے لیے جہاں سے الگ اِک جہاں ہے تو
گلگشتِ شوق کے لیے باغِ جناں ہے تُو

تو میری جاں کے ہر رگ و پے میں ہے موجزن
تو مجھ پہ ہے محیط تو میں تجھ میں ہوں مگن

یہ سر خدا کرے نہ ہو جب سر میں تو نہ ہو
وہ دن نہ ہو کہ دل میں تری آرزو نہ ہو

نوحۂ رشید

راقم ۱۰ ستمبر ۱۹۰۲ء کی شام کو بعد غروبِ آفتاب جواں مرگ عبدالرشید چشتی بی اے مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اس وقت جن جذبات نے دل پر ہجوم کیا ان کی عکسی تصویر ذیل کے چند شعروں میں کھینچی گئی ہے ۔ نیرنگ

اشکِ حسرت ترے مدفن پہ بہانے آیا
تو نے جو داغ دیا تجھ کو دکھانے آیا

مرض الموت میں بھیجا تھا جسے عید کا کارڈ
وہ ترے بسترِ خاکی کے سرہانے آیا

جس کے شعروں کو بہت شوق سے تو سنتا تھا
آج وہ تجھ کو ترا نوحہ سنانے آیا

رات اندھیری سے طبیعت پریشاں ہو تری
شعلۂ آہ کی اک شمع جلانے آیا

چھوڑ احباب کو سوتا ہے بڑا چین سے تو
نعرۂ درد سے میں تجھ کو جگانے آیا

ہائے جس کے لیے صد دولتِ بیدار تھا تو
وہ پدر خود تجھے مرقد میں سلانے آیا

بیٹے جی پھول سے تھی تجھ کو بہت کچھ نسبت
میں ترے ڈھیر پہ بھی پھول چڑھانے آیا

ملتی جلتی تھی بہت پھول سے خصلت تیری
سیرِ گلزار سے کچھ کم نہ تھی صحبت تیری

بوئے گل جیسے کہ پھیلاتی ہے ہر سمت نسیم
اس طرح پھیلی تھی اخلاق کی نکہت تیری

یار و اغیار میں کچھ فرق نہ تو کرتا تھا
مسکراہٹ ترے ہونٹوں پہ تھی طینت تیری

تجھ کو کینے سے تعلق نہ تعصب سے لگاؤ
وسعتِ تامہ رکھتی تھی محبت تیری

جس طرح پھول ہے دو روز میں کملا جاتا
اس طرح تھوڑی سی تھی عمر کی مدت تیری

تھی خوشی تیری عزیزوں کو ہنسائے رکھنا
بہجتِ خاطرِ احباب مسرت تیری

تو وہ تھا جس کو پیمبر نے کہا ہے مومن[1]

ہاتھ سے لب سے ایذا نہ تھی عادت تیری

گردشِ چنبرِ دوّار نے جینے نہ دیا
میں سے تجھ کو ستم گار نے جینے نہ دیا

کچھ تو ارمان عزیزوں کے نکلتے اے کاش!
چار دن بھی تجھے خونخوار نے جینے نہ دیا

ایک جاں اس پہ دن رات ہجومِ آلام
کثرتِ مجمعِ افکار نے جینے نہ دیا

تُو تو دکھانہ تھا آزار کسی کا بھی رَوَا
ہائے تجھ کو ترے آزار نے جینے نہ دیا

تھا جس آئین کے نکتوں میں تعمق تجھ کو
اسی آئینِ پُراسرار نے جینے نہ دیا

شاہدِ راز کے جلوے کا جو تھا تو مشتاق
ہاں اسی حسرتِ دیدار نے جینے نہ دیا

سخت جانی سے ہے نیرنگ بھی آخر زندہ

تجھ کو کیوں موتِ جفاکار نے جینے نہ دیا

---

[1] حدیث اَلْمُؤْمِنُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ (مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے انسان بچا رہے۔ نیرنگ)

کوہستان کا نظّارہ

ہاں مبارک تجھے اے دید کی مشتاق نظر
ایک باغِ گلِ نظارہ ہے شملے کا سفر

قلۂ کوہ جو ابھرا ہے تو اک شان کے ساتھ
کھڈ جو گہرائی میں اترا ہے تو اک آن کے ساتھ

ق

چوٹیوں اور کھڈوں پر جو ذرا کیجیے نظر
اور روئیدگی کا دیکھیے منظر یہ اثر

سبزہ ہی سبزہ ہر اک سمت نظر آتا ہے
ایک دریائے زمرّد ہے کہ لہراتا ہے

صفحۂ دل کشِ کہسار عجب گلشن ہے
سبزہ و گل سے جو قلّہ ہے سو اک خرمن ہے

نخلبندِ چمنِ دہر ہے مالی اِس کا
گل سے رہتا نہیں دامن کبھی خالی اس کا

یاں جو پودا ہے سو ہے سرو کی صورت آزاد
خوشنوایانِ چمن کو نہیں خوفِ صیّاد

پھول اک طرزِ دلآویز سے کھلتے ہیں یہاں
شجر اک جنبشِ مستانہ سے ہلتے ہیں یہاں

۱؎ یہ نظم "روحِ نظم" جلد دوم (صفحہ ۱۲۴) میں بھی شامل ہے۔

پہنی ہیں پھولوں نے خوش رنگ قبائیں کیا کیا
دل لبھاتی ہیں پرندوں کی صدائیں کیا کیا
دیکھنا اڑتی ہوئی تیتریوں کے انداز
گویا قدرت نے عطا کی ہے گلوں کو پرواز
کس قدر حسن بکھیرا ہے یہاں قدرت نے
کیا دیرانے کو فردوس نشاں قدرت نے

دیکھیے! سامنے اک کھڈ سے وہ بادل اٹھا
اک علم نور کا آکاش میں لہرانے لگا
لے لو! وہ اور بھی کچھ ابر کے پارے آئے
سیکڑوں رنگ سے جوبن کو نکھارے آئے
نہیں بادل کے یہ ٹکڑے، یہ ہیں چنچل پریاں
محوِ سیرِ کرۂ باد ہیں رقصاں رقصاں
ان میں یہ ناز یہ چھل بل یہ ادا یہ گھاتیں
بادلوں کو کہیں آتی ہیں بھلا یہ باتیں؟
نیلی پوشاک کسی کی ہے کسی کی ہے ہری
کوئی مٹیالی پری ہے تو کوئی سرخ پری
کیسی اٹھکیلیاں کرتی ہیں ہوا سے دیکھو!
ناچتی پھرتی ہیں کیا پیاری ادا سے دیکھو!
لے لو! سب چھپ گئیں دامن میں گھٹا کے پریاں
ہو گئے بارشِ باراں کے مہیا ساماں

وہ برسنے کو ہے پانی وہ گھٹائیں آئیں
مینہ کا پیغام لیے ٹھنڈی ہوائیں آئیں

ابر نے ڈھانپ لیے سب شجر و کوہ و زمیں
گویا جز ابر کے دنیا میں کوئی چیز نہیں

رعد نے آکے جو احکام میں کچھ تیزی کی
وہ لگی دینے گھٹا داد گہر ریزی کی!

کھل گیا ابر، فلک صاف نظر آنے لگا
نیلگوں حسن کی نیرنگیاں دکھلانے لگا

واہ یہ صاف یہ شفاف یہ گہری نیلک٭
نہ زمرد میں یہ رنگت نہ یہ نیلم میں دمک

دیکھتا ہے اسے انسان تو کیا سوجھتی ہے
طائرِ روح کو پروازِ فضا سوجھتی ہے

سامنے دور افق تک جو نظر جاتی ہے
وہاں تک کوہ کی نیلک ہی نظر آتی ہے

نظر آتا ہے افق میں جو ذرا ابرِ سفید
شوقِ نظارہ طلب کو ہے سحر گاہِ امید

اک جھلک حسنِ ازل کی سی دکھا جاتا ہے
دل کو مشتاقِ رخِ یار بنا جاتا ہے

٭ نیلا کا اسم مصدری نیلاہٹ عموماً مستعمل ہے۔ میں نے دانستہ مگر بضرورت ٹھنڈک، رسیلک، کالک وزن پر نیلک گھڑ لیا ہے۔ (نیرنگ)

آبشاروں کا سرِ کوہ طرب خیز وہ شور!
ہائے وہ نغمۂ مستانہ وہ رفتار وہ زور!
ندیاں دودھ کی بہتی ہیں یہاں بے محنت
دیکھے فرہاد تو حسرت سے کہے یا قسمت
بحر کی تہ میں کوئی ہوگا پڑا مروارید
آبشاروں کو جو دیکھو تو ہمہ مروارید
آئی وہ دور سے مستانہ جھنجھوٹی کی صدا
گونج بھی ساتھ پیانو ہے بجاتی اپنا
آہ موسیقیٔ جاں بخش! جہاں سوز آہنگ!
تیری تاثیر سے ذی روح بنا تودۂ سنگ
گونج کیا ہے یہ ہے کہسار کی پُر درد صدا
اثرِ نغمہ سے ہے وجد میں پتھر گاتا
ہائے اس حسن کے مسکن میں بھی آفت ہے وہی!
اس گلستاں میں بھی انساں کی مصیبت ہے وہی!
پیش ہر وقت وہی پیٹ کا دھندا اس کو!
جبرِ حالات کا ہر دم وہی رونا اس کو!
وہی محنت وہی ذلت ہے مقدر اس کا
وہی حرماں وہی حسرت ہے مقدر اس کا
ورنہ یہ عرصۂ کہسار عجب منظر ہے
دل کو فرصت ہو تو پوجا کو عجب مندر ہے
ذرّے ذرّے میں یہاں ہے نظر آتا موہن
نت نئے روپ میں درشن ہے دکھاتا موہن

انجامِ محبّت

(حرماں نصیب گلیٹؔ زبانِ حال سے)

مجھ سے پوچھے کوئی انجامِ محبت کے مزے
بادۂ حرماں کی لذت، جامِ حسرت کے مزے

مجھ پہ احساں کر گئی وعدہ فراموشی تری
بے وفائی ہی نے دکھلائے شہادت کے مزے

کوئی بھی داستاں کو میری سن کر بول اٹھے
کاہے کو چکھتے ہتے یں نے یہ مصیبت کے مزے

گو سراب آرزو تھا تیرا پیمانِ وفا
پر ملے دھوکے میں بھی ہم کو حقیقت کے مزے

؎ مغرب کے مشہور فسانہ نگار وکٹر ہیوگو کے فسانہ "ٹائلرز آف دی سی" TOILERS OF THE SEA کو ختم کر کے راقم کے دل میں ان خیالات نے خود بخود ہجوم کیا۔ گلیٹ ایک حسینہ پر عاشق ہے۔ اس حسینہ کے چچا کا جہاز کہیں دور سمندر میں ٹوٹ کر غرق ہو گیا ہے یہ چچا ہی اس حسینہ کا سرپرست بلکہ بمنزلہ پدر ہے۔ وہ حسینہ اور اس کا چچا وعدہ کرتے ہیں کہ جو کوئی اس شکستہ جہاز کے انجن کو سمندر سے نکال لائے اس سے اس حسینہ کی شادی ہوگی گلیٹ اس شرط کو منظور کر کے دو ماہ کے لاتعداد مصائب جھیل کر انجن کو تنِ تنہا نکال لاتا ہے۔ مگر اس اثنا میں وہ حسینہ اپنا دل ایک اور کو دے بیٹھتی ہے۔ گلیٹ یہ دیکھ کر اپنے ہاتھ سے اپنے رقیب کی شادی اس حسینہ سے کرا کر خود سمندر میں ڈوب مرتا ہے۔ (نیرنگ)

آہ! امیدِ حصولِ مرہمِ مقصود میں
لوٹے ہیں کیا کیا مرے دل نے جراحت کے مزے

ذائقہ دردِ محبت کا تن آسانوں کو کیا
جانتے ہیں اہلِ ہمت ہی مصیبت کے مزے

بحرِ الفت میں تھا طوفانِ شدائد کا خطر
سب بھلا دیتے تھے پر امیدِ راحت کے مزے

بے وفا یارِ ستم پیشہ اگر نکلا تو کیا
کم نہیں راہِ وفا میں استقامت کے مزے

جامِ وصلت سے نہیں کم مجھ سے حرماں دوست کو
یہ خمارِ نشۂ صہبائے الفت کے مزے

بوالہوس ہی کو مبارک وعدۂ الفت ترا
ہم اٹھائیں گے بس اب ایثار و غیرت کے مزے

جان دیں گے اب تو قعرِ بحرِ ناکامی میں ہم
پائیں گے گم نامی مرقد میں شہرت کے مزے

چھٹ گئے امید کے پھندوں سے اب نیرنگ ہم
یاس نے ہم کو دیے عیش و مسرت کے مزے

صدائے اسلام

گلشنِ عرفاں کو دینے رنگ و بو آیا ہوں میں
اس چمن میں بن کے آئینِ نمو آیا ہوں میں

دردِ دل ہی حضرتِ انساں کے دکھ کی ہے دوا
دل میں بن کر دردِ دل کی آرزو آیا ہوں میں

جس سے مستوں کو چھکایا تھا خلیل اللہ نے
بزم میں لے کر وہی جام و سبو آیا ہوں میں

ناامیدوں کو سنایا میں نے پیغامِ امید
ساتھ لے کر مژدۂ لاتقنطو آیا ہوں میں

روح کو ہوں قبلۂ حق کے لیے قبلہ نما
دل میں بن کر رازِ جاں کی جستجو آیا ہوں میں

ظلمتِ کثرت کی چھائی تھی گھٹا چاروں طرف
مہرِ وحدت ہوں چمکنے سو بہ سو آیا ہوں میں

تھا یہ بازارِ جہاں میں اک متاعِ کس مپرس
گوہرِ حکمت کی بن کر آبرو آیا ہوں میں

بھائی بھائی نوعِ انساں کو بنا دوں تو سہی
ہاں مٹانے ہستیٔ غیر و عدو آیا ہوں میں

عدل سے الفت ہے مجھ کو مفسدی سے بیر ہے
امن پھیلانے جہاں میں چارسو آیا ہوں میں

سنتِ باری کی ہے احکام میں میرے جھلک
اصلِ فطرت کے مطابق ہو بہو آیا ہوں میں

سب رسولوں کی زبانوں پہ مرا افسانہ تھا
شمعِ بزمِ راز تھا میں، ہر نبی پروانہ تھا

اختلافِ فرع کی گو ڈال رکھی تھی نقاب
جلوہ گر اول سے میرا عارضِ جانانہ تھا

دم مرا بھرتا تھا موسیٰ، میرا شیدا تھا خلیل
عیسیٰ مریم بھی میرے حسن کا دیوانہ تھا

دورِ آخر میں کیا کامل مجھے اس نور نے
جس کی شمعِ بزم کا روح الامیں پروانہ تھا

جلوہ گر وہ نور تھا اس کی جبینِ ناز میں
دیدۂ موسیٰ جھلک سے جس کی حیرت خانہ تھا

تاڑنے کو تاڑ ہی جاتے ہیں اربابِ نظر
میم کے پردے میں چھپنا نازِ معشوقانہ تھا

سب بنی آدم کو اس نے ایک کنبہ کر دیا
اس کے حسنِ خلق سے اپنا ہر اک بیگانہ تھا

بن گیا فیضِ قدم سے اس کے فردوسِ بریں — ورنہ ریگستانِ یثرب کیا تھا؟ اک ویرانہ تھا

اس کا اِک اِک فعل انساں کی محبت سے بھرا — اُس کا اِک اِک قول دِل سوزانہ، ہمدردانہ تھا

اُس کے ہاتھوں سے بنا اِک نخلِ سبز و بارور

میں خلیل اللہ کا بویا ہوا اِک دانہ تھا

تم سے خود اپنا علاج دردِ نکبت ہو تو ہو — نسخۂ امدادِ خود کردن سے صحت ہو تو ہو

پھوٹ کی تلوار نے زخمی کیا جس قوم کو — اُس کا درماں نوش دارُوئے اخوت ہو تو ہو

کینہ و بغض و حسد ہیں میرے مسلک سے بعید — جوشِ الفت ہو تو ہو، دردِ محبت ہو تو ہو

عزتِ دنیا کا رستہ، حرمتِ عقبیٰ کی راہ — شاہراہ سنتِ ختمِ رسالت ہو تو ہو

قوم کی غلطی کو ثابت کر چکے ہیں واقعات — اس پہ بھی اسرار و استدلال و حجت ہو تو ہو

ماننے میں جو نہ آئیں ہادیٔ مشفق کی بات — ایسے لوگوں کی اگر ایسی بُری گت ہو تو ہو

خیر و برکت ہو تو کیوں کر ہے دلی کے کام میں — صدقِ نیت ہو تو ہو، جوشِ ارادت ہو تو ہو

تجربہ ہی اہلِ غفلت کے لیے استاد ہے — خود زمانہ رہبرِ راہِ ہدایت ہو تو ہو

عزت و ذلت کا کیا احساس جب غیرت نہیں

جوشِ غیرت رہنمائے راہِ ہمت ہو تو ہو

سودائے خام

جو ہو مجھ سے پیار تم کو، جو ہو تم سے پیار مجھ کو
نظر آئے خارِ ہستی گُلِ نوبہار مجھ کو

یہ ضیائے مہرِ تاباں — یہی آتی جاتی گھڑیاں
یہ فضا یہ سبز پودے — یہی گُل، یہی پرندے
یہ کمالِ حسن و زینت — مجھے دیں نویدِ راحت
مری زیست کا ترانہ — ہو سرودِ دلبرانہ
نہ یہ بے سری صدائیں کریں بے قرار مجھ کو
جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو

جو ہو مجھ سے پیار تم کو! — مگر آہ! یہ کہاں ہو؟
کوئی انقلاب آئے — تو وہ دن مجھے دکھائے
کہ ہو شہ گدا کا مہماں — ہو زمیں پہ مہ خراماں
مری خوش نصیبیوں کا — ہو ہر اک زباں پہ چرچا
مرے عشق کی حکایت — بنے دفترِ مسرت
کرے مستِ عیشِ دائم مئے دیدِ یار مجھ کو
جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو

جو ہو تم سے پیار مجھ کو — مری عمر یوں بسر ہو
کروں غرقِ بحرِ نسیاں — غمِ دہر و فکرِ ساماں
یہ مشقتِ پشیماں — یہ ہجومِ یاس و حرماں

ابھی قدموں میں پڑا ہوں! تمھیں مسکراتے دیکھوں!
مری زیست، ہو محبّت کرم مغانِ الفت
مے بے خودی پلاکر کرے ہوشیار مجھ کو
جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو

جو ہو مجھ سے پیار تم کو جو ہو تم سے پیار مجھ کو
مگر آہ! تم بتوں کا نہیں اعتبار مجھ کو
یہ کہاں ہے اپنی قسمت کہ ہو مجھ سے تم کو الفت!
تمھیں حسن و خود پرستی مجھے عشق و حال مستی
ملیں پھر جو ہم تو کیوں کر؟ جئیں یوں ہی زندگی بھر!
دم واپسیں تک آئے جاں! رہیں دل کے دل میں ارماں!
پسِ مرگ بھی کھٹکتا یہ جگر میں خار جائے!
لبِ گور بھی تڑپتا دلِ بے قرار جائے!

حالتِ قوم

دل بھر آیا قوم کی حالتِ پریشاں دیکھ کر
رو پڑے ہم اپنی بربادی کے ساماں دیکھ کر
یاد آتی ہے ہمیں عشرتِ ایامِ گل
حالِ بلبل غیر ہے رنگِ گلستاں دیکھ کر
اب کہاں وہ دن ہیں کہ جب خیرہ تھی چشمِ آفتاب
شوکتِ اسلامیاں کے ساز و ساماں دیکھ کر
صولتِ اہلِ عرب کی دھوم تھی آفاق میں
کانپ جاتے تھے [illegible] دیکھ کر
ایسی وقعت رکھتے تھے بغداد کے شاہی کوشک
سر جھکا دیتا تھا جنہیں گردونِ گرداں دیکھ کر
قوم کا گلزار ایسا تازہ و شاداب تھا
سایہ پڑ جاتا تھا جس کو رنگِ بستاں دیکھ کر
ہیں مقامِ عبرت اب بغداد و دہلی کے کھنڈر
سیکھ کچھ اے غافل! یہ اوراقِ پریشاں دیکھ کر
سیکھ لو کچھ تم بھی رنگِ عبرت تاریخ پر!
جا بجا نقشِ قدم ہائے بزرگاں دیکھ کر

بار مت اہمت کو تو اے راہ گیرِ حبِّ قوم!
دشتِ کوشش کو پُر از خارِ مغیلاں دیکھ کر

المدد ہمت! کہ دل سے آرزو چلنے کو ہے
غلبۂ اندوہ و استیلائے حرماں دیکھ کر

کیا رہے محروم اپنی ہی تمنّا کی صدف
ہاں! برسنا چاہیے اے ابرِ نیساں دیکھ کر

آرزو تو گُدگُداتی ہے ارادے کو مگر
دل بجھا جاتا ہے حالِ شوقِ یاراں دیکھ کر

ناخلف ہونے پہ اپنے اور بھی آتی ہے شرم
ایک عالم کو بزرگوں کا ثنا خواں دیکھ کر

جادۂ تعلیم پہ اقوامِ مغرب ہیں رواں
علم میں خاصیتِ مہرِ سلیماں دیکھ کر

بے تردّد پا کے کشتِ آرزوئے قوم کو
رو پڑے ہم جانبِ ابرِ بہاراں دیکھ کر

کیا کوئی قسمت کو اپنی روئے جب سنبھلے نہ قوم
اپنی بربادی کے آثارِ نمایاں دیکھ کر

ہندوؤں کی ہے ہمارے سامنے اچھی مثال
کیوں نہ عبرت گیر ہو انساں کو انساں دیکھ کر

ہے ازل سے قاعدہ یہ زیست کی شطرنج کا
اور قومیں کیوں نہ جیتیں ہم کو ناداں دیکھ کر

کاش ہو ایسی یکایک قوم کی حالت درست
جیسے جاگ اُٹھے کوئی خوابِ پریشاں دیکھ کر
وہ بہاریں دَورِ گردوں نے بھلائی ہیں ہمیں
خلد شرمائے ہمارا باغِ نسیاں دیکھ کر
قوم کا غم جاں گزا ہے جس قدر روئیں سو کم
ہاں! مگر اپنی بساط اے چشمِ گریاں دیکھ کر

غزلیات

کیوں ہم پہ ہیں یہ قہر کی آفت کی نگاہیں
الفت کی نگاہیں نہ محبّت کی نگاہیں

مت پوچھ کہ کیا کیا نہ ستم ڈھا گئیں دل پہ
شرماتی ہوئی تیری شرارت کی نگاہیں

افسوں تھیں کہ جادو تھیں کہ فتنہ تھیں کہ بجلی
آفت کی نگاہیں تھیں قیامت کی نگاہیں

کیا قہر کی باتیں تھیں تری پیار کی باتیں
آفت کی نگاہیں تھیں محبّت کی نگاہیں

ہونے کو گل و لالہ بھی ہیں شمس و قمر بھی
تیری ہی طرف اٹھتی ہیں خلقت کی نگاہیں

تم بھی تو سنو آ کے کبھی تم بھی تو دیکھو
ارمان کی باتیں مری حسرت کی نگاہیں

کس جلوے کی رہتی ہے تلاش آپ کو نیرنگ
گھبراتی ہوئی پھرتی ہیں حضرت کی نگاہیں

○

کٹ گئی بے مدعا ساری کی ساری زندگی
زندگی سی زندگی ہے یہ ہماری زندگی

کیا ارادوں سے ہے حاصل، طاقتِ فرصت کہاں؟
ہائے! کہلاتی ہے کیوں بے اختیاری زندگی

اے سرِ شوریدہ! اب تیرے وہ سودا کیا ہوئے!
کیا سدا سے تھی یہی غفلت شعاری زندگی؟

دردِ الفت کا نہ ہو تو زندگی کا کیا مزا؟
آہ و زاری زندگی ہے بے قراری زندگی

آرزوئے زیست بھی یاں آرزوئے دید ہے
تو نہ پیارا ہو تو مجھ کو ہو نہ پیاری زندگی

اور مرجھا جائے گی تیری چھیڑ سے دل کی کلی
کر نہ دوبھر مجھ پہ اے بادِ بہاری زندگی

یاں تو اے نیرنگ! دونوں کے لیے ساماں نہیں
موت بھی مجھ پر گراں ہے گر ہے بھاری زندگی



کبھی صورت جو مجھے آکے دکھا جاتے ہو
دن مری زیست کے کچھ اور بڑھا جاتے ہو

اِک جھلک تم جو لبِ بام دکھا جاتے ہو
دِل پہ اِک کوندتی بجلی سی گرا جاتے ہو

میرے پہلو میں تم آؤ یہ کہاں میرے نصیب!
یہ بھی کیا کم ہے تصوّر میں تو آ جاتے ہو

تازہ کر جاتے ہو تم دِل میں پرانی یادیں
خوابِ شیریں سے تمنّا کو جگا جاتے ہو

اتنی ہم کو بھی دکھاتے ہو مسیحا نفَسی
حسرتِ مردہ کو آ آ کے جِلا جاتے ہو

نگہِ لطف میں جادہ ہے تمہاری جاناں
سارے شکوے گلے اِک پل میں بھُلا جاتے ہو

شعلۂ طور سے تو وادیٔ ایمن ہی جلا
تم جہاں آتے ہو اِک آگ لگا جاتے ہو

ہے تو نیرنگ! وہی عشق کا رونا دھونا
انھی باتوں میں نیا رنگ دکھا جاتے ہو



نہ کیوں کہ اہلِ نظر کو رُلائے خندۂ گل؟
فسردگی ہی تو ہے انتہائے خندۂ گل

کرشمہ خیزیِ الفت سے کیا تعجب ہے
سنے جو گوشِ عنادِل صدائے خندۂ گل

ہجومِ غم سے نہ مایوس باغِ دہر میں ہو
گرفتہ خاطری ہے ابتدائے خندۂ گل

بہار ہی کے جو لائق ہے کیا ہی موزوں ہے
تنِ عروسِ چمن پر قبائے خندۂ گل

جھلک رہا ہے عجب آب و تاب سے جوبن
بہار اوڑھے ہوئے ہے ردائے خندۂ گل

وہ خندہ لب جو کبھی آ گیا تو دیکھیں گے
چمن میں بندھ تو رہی ہے ہوائے خندۂ گل

خزاں کو آنے دے مست، پھول موسمِ گل پر
رُلائے گی تجھے بلبل ہوائے خندۂ گل

کوئی پرایا ہو اپنا ہو ہنس کے خلق سے مل
یہ کہتی ہے تجھے غافل ادائے خندۂ گل

بہ عینِ قہقہہ کیا کام اشکِ شبنم کا؟
کوئی تو دردِ نہاں ہے قفائے خندۂ گل

فنا غرض کے سے ہوں کان تو سنے تو بھی
صدائے نغمۂ رنگیں، نوائے خندۂ گل

یہ شایاں ہے عاشق کا دستور رہنا
ترے جور سہہ کر بھی مسرور رہنا

غضب ہے رقیبوں سے لگ لگ کے چلنا
مگر ہم غریبوں سے یوں دور رہنا

بقا بعدِ مردن اگر ہے تو یہ ہے
ہمیشہ زمانے میں مشہور رہنا

وہ قسمیں کہ ان سے ملیں گے نہ ہرگز
مگر دل کے ہاتھوں سے مجبور رہنا

ستم ہے ہمارے ہی دل میں سمانا
ہماری ہی آنکھوں سے مستور رہنا

تری مست آنکھوں سے سیکھا ہے میں نے
شرابِ تخیل سے مخمور رہنا

جلانے کو لایا ہوں میں رختِ ہستی
خبردار اے شعلۂ طور رہنا

بنا دے اسے عشقِ ذات، قبرِ جنت
مرے دل میں اے غیرتِ حور رہنا

جو ان سے ملو گے تو سمجھو گے نیرنگ
بتوں سے ذرا دور ہی دور رہنا

یہ غزل پہلی مرتبہ ہفتہ وار "پنجۂ فولاد" (لاہور) ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔



فریبِ آرزو نیرنگِ تاثیرِ فغاں تک ہے
طلسمِ اعتبارِ عہد و پیمانِ بتاں تک ہے

دلِ عاشق سے پوچھو عشق کی تلخی کے چٹخارے
کہ زہرابِ محبت کی حلاوت کامِ جاں تک ہے

ڈبویا بختِ گوہر نے استادِ ملائک کو
رسائی خاک کی خلوت سرائے لامکاں تک ہے

قفس کھل جائے تو میں پرشکستہ ہی پہنچ جاؤں
کہاں کا فاصلہ ایسا قفس سے آشیاں تک ہے

چمن زارِ تصور ہی میں محوِ دیدِ گل ہوں میں
بہت تھوڑا تفاوت یاں قفس سے آشیاں تک ہے

بر آئے گی اُمیدِ بلبلِ آفت طلب یعنی
نہیبِ برقِ سوزاں آشیاں سے آشیاں تک ہے

فدا ہو آپ پر کوئی تو کس اُمید پر آخر؟
وفا کا آپ کی خو میں کہیں نام و نشاں تک ہے؟

بہت ہمدردیاں ہیں کوہکن کی تیشہ رانی سے!
کبھی اے کاش! دیکھو میری جاں کاوی کہاں تک ہے

تم اپنی دل نوازی کے بہت احساں جتاتے ہو
ذرا یہ بھی تو دیکھو میری جاں بازی کہاں تک ہے

تری توفیق یاور ہو تو سارے کام سیدھے ہیں
یہ ناکامی کا کھٹکا میری سعیِ رائیگاں تک ہے

انھیں کر کے جدا آرام سے سب بیٹھ جائیں گے
عناصر کی کشاکش اتحادِ جسم و جاں تک ہے

وہ بے مہر اور غیروں سے وفا؟ کیوں کر یقیں آئے
تکلّف برطرف ہاں میرے رشکِ بدگماں تک ہے

مری نظروں میں زاہد! اور ہی جلوے سمائے ہیں
نظر تیری تو حسنِ حور و غلمانِ جناں تک ہے

غزل میں لطف ہی اب کیا ہے لیکن کچھ جو باقی ہے
سو تقلیدِ ادائے غالبِ معجز بیاں تک ہے

کوئی نیرنگ! لطفِ جدتِ مضموں تو دکھلائے
یہ اندازِ خصوصیت تو بس طرزِ بیاں تک ہے



مانوس کیوں نہ ہو دلِ وحشی حبیب سے
اک یارِ دل نواز ملا ہے نصیب سے

کہہ دے گی دور سے نگہِ شوق وہ پیام
الفاظ جس کو کہہ نہیں سکتے قریب سے

اک ہجر و وصل کیا، کسی حالت میں کل نہیں
ہیں تیرے ڈھولے دلِ ناداں! عجیب سے

اے ولولۂ نارسائیٔ دستِ درازِ شوق!
اور آپ کا نکل کے وہ جانا قریب سے

ہم نے انھیں سنا ہی دیا ماجرائے دل
حالِ مریض کیوں کہ چھپاتے طبیب سے

اللہ رے ان کی اٹھتی جوانی کی شوخیاں!
بچپن میں تھے جو بھولے سے چپ سے غریب سے

جلتے کے دل کو اور جلانا ضرور تھا
ہم نے نوازشیں تری کہہ دیں رقیب سے

لاکھوں گلوں میں اک اسی جلوے کی ہے تلاش
سیکھو اصولِ اہلِ نظر! عندلیب سے

تحسینِ حسنِ یار میں میرا ہے ہم خیال
نیرنگ! کیوں نہ ہو مجھے الفت رقیب سے



دِل لگانا کوئی آفت ہی سہی   اب تو جھیلیں گے مصیبت ہی سہی

کب کہا میں نے کہ دِل سے چاہو   اے وہ منھ دیکھے کی الفت ہی سہی

مردۂ منتظرِ حشر ہوں میں   آپ کا نام قیامت ہی سہی

میں بھی ہوں عشق میں رسوائے جہاں   حسن میں آپ کی شہرت ہی سہی

ہے مسافر کو نگہ بھی کافی   نہیں الفت تو مروت ہی سہی

مجھ سے ہو انس تو احساں کیجیے   غیر سے آپ کو نفرت ہی سہی

ہم بھی یاد آئیں گے سر چڑھ کے کبھی   بھول جانا تری عادت ہی سہی

کچھ تو لایا ترے در سے نیرنگ

آخری دید کی حسرت ہی سہی



نوید یاس دیتی ہے مجھے ہر آرزو میری
نہ کر مٹی خراب اے سعیِ ہیچ انجام تو میری

چھپے ہو سات پردوں میں بھی تم تو اس سے کیا حاصل
تمہارے عشق میں رسوائیاں ہیں کو بہ کو میری

چھپو گے کیا مرا ذوقِ طلب بھی تم نے دیکھا ہے
ورائے لامکاں ہے انتہائے جستجو میری

یہ پیچ و تاب یہ الجھن یہ اندازِ پریشانی
کہانی تیرے گیسو کہہ رہے ہیں ہو بہو میری

جہت کی قید کو توڑا ہے سودائے محبت نے
لگی ہیں تیرے چہرے پر نگاہیں سو بہ سو میری

ترا انصاف جب مجھ کو ذرا آنکھیں دکھاتا ہے
بندھا دیتا ہے ڈھارس مژدۂ لَاتَقنطوا میری

طلب نے کھائی ہیں وہ ٹھوکریں راہِ تمنا میں
کہ آخر مجھ سے شرمانے لگی ہے آرزو میری

وہ گل ہوں سادگی میں میری سو رنگینیاں نکلیں
مشامِ روح کو بھاتی ہے بھینی بھینی بو میری

مرا ہر لفظ سادہ اِک صدف ہے دُرِّ معنی کا
سمجھ پیدا کرے تو کوئی سمجھے گفتگو میری

تصنّع کا نہیں احسان میری قدر و قیمت پر
ملی فطرت سے مجھ کو مثلِ گوہر آبرو میری

سلاست مانعِ مشکل پسندی ہو نہیں سکتی
ادق ہے حضرتِ نیرنگ طرزِ گفتگو میری



جھوم جھوم آتی ہیں مستانہ گھٹائیں کیا کیا
رات دن چلتی ہیں جاں بخش ہوائیں کیا کیا

دی ہے برسات کے جھونکوں نے نوید رحمت
ورنہ کیں خلق پہ گرمی نے جفائیں کیا کیا

آہ! کوئل کی یہ تانیں یہ پپیہے کا الاپ
شورش انگیزِ جنوں ہیں یہ صدائیں کیا کیا!

اٹھتی ہیں سیکڑوں بے نام امنگیں اس میں
آگ سی دل میں لگاتی ہیں ہوائیں کیا کیا

برق کو دیکھ کے کیا دل پہ گھٹا سی چھائی
بجلیاں دل پہ گراتی ہیں گھٹائیں کیا کیا

آہ! اے چاند! بہاروں پہ ہے تیرا جوبن
تو نے برسات سے سیکھی ہیں ادائیں کیا کیا!

کج کلاہانِ گل و غنچہ کی سج دھج کیا خوب
جامہ زیبانِ چمن کی ہیں قبائیں کیا کیا!

کس قدر گوہر و الماس بکھیرے نیرنگ
خسروِ ابر کی ہیں ہم پہ عطائیں کیا کیا!

---

* "کلام نیرنگ" میں یہ غزل "برکھا رُت" کے عنوان کے تحت شامل ہے۔



کہتے ہیں عید ہے آج، اپنی بھی عید ہوتی
ہم کو اگر میسر جاناں کی دید ہوتی

قیمت میں دیدِ رُخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے
بازارِ ناز لگتا، دل کی خرید ہوتی

کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سنتے
نازو نیاز کی یوں گفت و شنید ہوتی

جلوے دکھاتے جاتے وہ طرزِ دلبری کے
اور دل میں یاں ہوائے نازِ مزید ہوتی

تیغِ نظر سے دل پر وہ وار کرتے جاتے
اور لب پہ یاں صدائے ھل من مزید ہوتی

ابرو سے ان کے غمزہ تیرِ ادا لگاتا
یہ دل قتیل ہوتا، یہ جاں شہید ہوتی

کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لطفِ جاناں
کچھ وعدہ سا ہوتا، کچھ کچھ امید ہوتی

لیکن یہاں تو حرماں ہے مژدۂ تمنا
کیوں قفلِ آرزو کی پیدا کلید ہوتی

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اُن کی اِک جھلک کو
نیرنگِ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی

"کلامِ نیرنگ" میں یہ غزل "عید اور انتظارِ یار" کے عنوان کے تحت شامل ہے۔



فغان و آہ کس امید پر کرے کوئی
وہ کہتے ہیں ترے نالوں سے کیوں ڈرے کوئی

یہی بدا تھا مقدر میں روزِ اوّل سے
کسی کے حسنِ جہاں سوز پر مرے کوئی

بتوں سے کس کو امیدِ وفائے الفت ہے
عبث کسی کی محبت کا دم بھرے کوئی

تری جفاؤں سے اُکتا کے دل کو سمجھایا
یہ نامراد نہ مانے تو کیا کرے کوئی

سکھا دیا ہے کہیں آس پاس والوں نے
کسی سے رہنے لگا ہے پرے پرے کوئی

سوالِ وصل نہیں شرحِ شوقِ دید نہیں
تمھارا ہرج ہے؟ اگر تم پہ یوں مرے کوئی

پیامِ مرگ ہے عشقِ پری رخاں نیرنگ!
نہ ہو یہ روگ تو کیوں بے اجل مرے کوئی



وہ دستِ وحشت و چاکِ گریباں یاد آتے ہیں
جنونِ فتنہ ساماں کے وہ ساماں یاد آتے ہیں

کہاں وہ ہمتیں اگلی سی سودائے محبت کی
وہ پائے دشت پیما وہ بیاباں یاد آتے ہیں

ہجومِ یاس نے کیسی بھری محفل اجاڑی ہے
ہمیں وہ حسرتیں وہ اپنے ارماں یاد آتے ہیں

کبھی اک اک نگہ میں تیری سو سو جاں نوازی تھی
ترے انداز وہ اے لطفِ جاناں یاد آتے ہیں

کبھی الطافِ پنہاں کا سماں آنکھوں میں پھرتا ہے
کبھی تیرے ستم ہائے نمایاں یاد آتے ہیں

وہ فقرے وہ نگاہیں وہ ادا وہ عشوہ پیہم
وہ تیر و نشتر و شمشیر و پیکاں یاد آتے ہیں

جفائیں آپ کی ہم کو بھلا دیں طولِ فرقت نے
اگر کچھ یاد آتے ہیں تو احساں یاد آتے ہیں

محبت اٹھ گئی کچھ رنگِ ہستی ہی نرالا ہے
وہ اگلی صحبتیں وہ اگلے انساں یاد آتے ہیں

وہ شغلِ عاشقی نیرنگ، کچھ ہو پھر بھی اچھا تھا
ہمیں اب وہ تمنائیں وہ حرماں یاد آتے ہیں



پھر وہی ہم ہیں خیالِ رُخِ زیبا ہے وہی
سرِ شوریدہ وہی ، عشق کا سودا ہے وہی

دانہ و دام سنبھالا مرے صیاد نے پھر
اپنی گردن ہے وہی ، عشق کا پھندا ہے وہی

پھر لگی رہنے تصور میں وہ مژگانِ دراز
رگِ جاں میں خلشِ خارِ تمنا ہے وہی

پھر لگا رہنے وہی سلسلۂ راز و نیاز
جلوۂ حسن وہی ذوقِ تماشا ہے وہی

پھر ہوا ہم کو دل و دیں کا بچانا مشکل
نگہِ ناز کا پھر ہم سے تقاضا ہے وہی

ناز نے پھر کیا آغاز وہ اندازِ نیاز
حسنِ جاں سوز کو پھر سوز کا دعویٰ ہے وہی

محوِ دیدِ چمنِ حسن ہے پھر دیدۂ شوق
گلِ شاداب وہی بلبلِ شیدا ہے وہی

پھر چمک اٹھی وہ کجلائی ہوئی چنگاری
رختِ ہستی پہ وہی عشق کا شعلہ ہے وہی

آرزو جی اٹھی پھر پیار جو اس بت نے کیا
پھر لبِ یار میں اعجازِ مسیحا ہے وہی

پاسِ ناموس نے پھر رخصتِ رفتن چاہی
شہرتِ حسن وہی الفتِ رسوا ہے وہی

پھر ہوئی لیلیٰ و مجنوں کی حکایت تازہ
آن کا عالم وہی نیرنگ کا نقشہ ہے وہی



میرے پہلو سے جو نکلے وہ مری جاں ہو کر
رہ گیا شوق دلِ زار میں ارماں ہو کر

زیست دو روزہ ہے ہنس کھیل کے کاٹو اس کو
گُل نے یہ راز بتایا مجھے خنداں ہو کر

اشکِ شادی ہے یہ، کچھ مژدہ صبا لائی ہے
شبنم آلودہ ہوا پھول جو خنداں ہو کر

تلخیاں ایسی مناسب نہیں شیرینی سے
بدمزہ مجھ سے نہ ہوں آپ مری جاں ہو کر

ذرۂ وادیِ الفت پہ مناسب ہے نگاہ
فلکِ حسن پہ خورشیدِ درخشاں ہو کر

شوخیاں اس نگہِ زیرِ مژہ کی مت پوچھ
دلِ عاشق میں کھُبی جاتی ہے پیکاں ہو کر

شدتِ شوقِ شہادت کا کہوں کیا عالم
تیغِ قاتل پڑی سر پہ مرے احساں ہو کر

ابر چھاتا ہے تو دھیان آتا ہے گیسو کا مجھے
کوندتی برق ہے یادِ رخِ تاباں ہو کر

اب تو وہ خبطِ مرے عشق کو کہہ کر دیکھیں
خود ہی آئینے کو تکنے لگے حیراں ہو کر

ہم نے باندھے ہیں مضامینِ کہن بھی نیرنگ
رنگ پر اپنا چمکتا ہے نئی شاں ہو کر



ہم تو پھر پاتے جو تو بھی کہیں مائل ہوتا
ترے لب پر بھی یہی شکوہ باطل ہوتا

شرم ہے اے نگہِ شوق! کہ وہ کہتے ہیں
تجھ کو بلوا کے میں رسوا سرِ محفل ہوتا

گر نتیجہ ہے توجّہ کا یہی ظلم و ستم
کاش ظالم! تو مرے حال سے غافل ہوتا

بھیس عشاق کا بھرتے نہ کبھی اہلِ ہوس
عشق، اے کاش! ذرا اور بھی مشکل ہوتا

اضطرابِ دلِ عاشق کی حقیقت کھلتی
کاش اے جاں ترے پہلو میں مرا دل ہوتا

اے ظالم! ترے پہلو میں یہ پتھر ہوگا
جل نہ جاتا مرے نالوں سے اگر دل ہوتا

یہ نرالی ہے تمنّا دلِ آزار پسند
عشق تو چاہتا ہے اور بھی مشکل ہوتا

قہر تو یہ ہے قیامت ہے وہ جانانِ نیرنگ
بات ہی کیا تھی اگر ظالم و قاتل ہوتا

غیر مدوّن کلام

دین و دنیا

کی ہے فطرت نے عطا چشمِ بصیرت جن کو
اور دی غور و تفکر کی ہے عادت جن کو

وہ چھپی طاقتیں آتی ہیں جنھیں صاف نظر
جن سے اقوام کی بہبود پہ پڑتا ہے اثر

قوم کی نبض کی حرکت کو جو پہچانتے ہیں
قوم کے روگ کے اسباب کو جو جانتے ہیں

قوم کے چال چلن سے جو بتا دیں فوراً
کہ بگڑنے کے ہیں یا بننے کے اس کے لچھّن

اہلِ اسلام پہ یہ رائے وہ رکھتے ہیں قوی
کہ پنپتی نظر آتی نہیں یہ قوم کبھی

شاید اس قوم کی ہے موت ہی اب آنے کو
نقش یہ صفحۂ ہستی سے ہے مٹ جانے کو

نہیں اے دوستو اس رائے میں کچھ بات عجیب
ہم ہی کوشش سے بلاتے ہیں تباہی کو قریب

اس طرف جاتی ہے حالات کی رَو سرعت سے
جیسے طوفاں میں دریا ہو رواں سطوت سے

یہ نظم انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۰۳ء میں پڑھی گئی تھی۔

سامنے اس کے جو اڑتا ہے بہا دیتی ہے

بند جو راہ میں حائل ہو گرا دیتی ہے

اوج پہ اختر اقبال ہے جن قوموں کا

رخ کو اس رَو کے سمجھتے ہیں وہ رہبر اپنا

اپنی کشتی کو چلاتی ہیں اسی دھار کے ساتھ

جیسی رفتار ہے رَو کی اسی رفتار کے ساتھ

ان سے ساحلِ مقصد پہ پہنچ جاتی ہیں

موجِ طوفاں کے تھپیڑوں سے وہ بچ جاتی ہیں

پر مسلمانوں کو اس رَو کی نہیں کچھ پروا

اس کے برعکس چلاتے ہیں یہ اپنی نیا

ٹوٹ کر ناؤ بنے لقمۂ گرداب تو کیا

کشتی طوفاں سے الٹ کر ہو جو غرقاب تو کیا

وہی پیش آئے گی تقدیر نے جو ٹھانی ہے

فکرِ انجام تقاضائے مسلمانی ہے

وقت ہے اب بھی اگر نیند سے ہو کر بیدار

ہم سمجھنے لگیں حالاتِ زماں کی رفتار

جن خیالات نے یہ حال کیا ہے اپنا

ان میں اک وہم یہ ہے دین ہے دنیا سے جدا

دین اک شے ہے نہیں زیست سے جس کو سروکار

نہیں ہم لوگوں کے جینے کا اس آئین پہ مدار

دین کیا شے ہے زر و مال سے نفرت کرنا!
زن و فرزند سے کینے کو مذمت کرنا!
ہاتھ دنیا سے دکھاوے کو اٹھائے رکھنا؟
دل میں پر حرصِ زر و مال چھپائے رکھنا
ہم نمازیں بھی جو پڑھتے ہیں تو اس صورت سے
کہ نہ فحشا ہی مٹے اس سے نہ منکر ہی رکے
دل پہ کچھ ان کا اثر ہے نہ خصائل پہ اثر
جب نہ سمجھیں تو بھلا کیا ہو شمائل پہ اثر
وعظ اگر ہیں تو ہیں صلاحِ رذائل سے بری
حسنِ اخلاق کی کیا حضرتِ واعظ کو پڑی
مجلسیں حال کی ہیں حال سے بالکل خالی
غور سے دیکھو تو واں قال ہے یا قوالی
مست ایسے کہ نہیں سعی سے کرتے کچھ کام
کرتے تقدیرِ الٰہی کو ہیں ناحق بدنام
دین کو دیکھ کے ہوتا ہے ہمارے مفہوم
پوست رکھتے ہیں یہ ہیں مغز سے اس کے محروم
یہ تو پھل لائی نہ دنیا سے ہماری نفرت
کہ مسلمانوں میں اس سے بڑھے رہبانیت
لیکن اتنا ہوا دولت کی مذمت کا اثر
کر لیا قوم کے افراد میں افلاس نے گھر

ہم جو دنیا کو بتاتے ہیں ہمیشہ مردار
ہم سے بھی دولتِ دنیا ہے سراسر بیزار

ہم جو دنیا کو نہیں دین سے کرتے ہیں قریں
اس تفرّق کا نتیجہ ہے کہ دنیا ہے نہیں

دیکھنا یہ ہے کہ دنیا ہے وہ کیا ٹھیک صفت
چاہیے جس سے ہو مردار سمجھ کر نفرت

عارفِ روم کا یہ قول ہے سب کو بھایا
کہ وہ دنیا ہے یہ اللہ سے غافل رہنا

اس سے مفہوم نہیں نامِ خدا سے غفلت
بلکہ مقصود ہے احکامِ خدا سے غفلت

اب وہ احکام ہیں کیا کھول کے قرآں دیکھو
اور حدیثوں کے مضامین نمایاں دیکھو

زندگی اپنی بنا دین کو مقصد ہے یہی
دھیان میں، بات میں، کاموں میں یہی دھن ہو تری

تیرے ہر فعل میں اثبات اخوّت کا ہو
عدل و احسان ہو ایتائے ذوی القربیٰ ہو

ہاتھ سے تیرے ہو نقصاں نہ زباں سے تیری
قولِ ہادی ہے کہ ایمان کے معنی ہیں یہی

صنعت و حرفت و محنت پہ تو راغب ہو جائے
دوست اللہ کا بن جاتے جو کاسب ہو جاتے

اس سے ثابت ہے کہ اسلام ہے قانونِ حیات
دین و دنیا کی جدائی ہے فقط کہنے کی بات

بلکہ دنیا جو نہ ہو دین کا امکاں ہی نہیں
فعل بے فاعل و مفعول بھی ہوتا ہے کہیں

ہم کہاں ہوتے جو دنیا ہی نہ ہوتی پیدا
دین پھر کس پہ؟ کہاں کے لیے؟ نازل ہوتا

گر نہیں دین کی کھیتی کو ضروری دنیا
کھیت کس واسطے دنیا کو ہے عقبیٰ کا کہا

انجمن پر ہے توقع کی نظر اپنی جمی
ان خیالات کی اصلاح اسی سے ہوگی

دین و دنیا کے تفرّق کو مٹاتے گی یہی
ان بڑی دیر کے بچھڑوں کو ملاتے گی یہی

ترانۂ مسرت[1] یعنی آمدِ اقبال[2]

اقبالؔ کا ولایت سے بخیریت واپس آنا اہلِ دل اور اہلِ سخن کے لیے کوئی معمولی خوشی کی بات نہیں ہے۔ یہی ایک شخص ہے جس کے دم سے اردو زبان کی اعلیٰ، حقیقی اور سچی شاعری کی تمام امیدیں آج وابستہ ہیں۔ ان کے واپس تشریف لانے سے اہلِ علم، اربابِ ذوق اور اصحابِ سخن میں ایک خاص مسرت پھیلی ہوئی ہے۔ راقم عرصۂ دراز سے دنیا کے دھندوں میں اس قدر گرفتار رہا ہے کہ شغلِ سخن سے قطعی محروم ہے۔ مگر اقبالؔ کی آمد کی خوشی نے انبالہ سے دہلی جاتے ہوئے ریل میں مندرجہ ذیل چند سطریں لکھوا ہی لیں۔ یہ چند سطریں ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاؒ قدس سرہٗ مقام دہلی میں ایک ایسی بزم میں پڑھی گئیں جس میں اقبالؔ کی شمعِ کمال کے چند پروانے جمع تھے۔ اور جہاں دن بھر اقبالؔ کی آمد کی خوشی میں یہ مہمان نوازی حضرت خواجہ

---

[1] مطبوعہ "مخزن"، اگست ۱۹۰۸ء ص ۹۲-۹۳

[2] علامہ اقبال انگلستان سے جولائی ۱۹۰۸ء میں وطن روانہ ہوئے تھے۔ وہ بمبئی سے ہوتے ہوئے ۲۵ جولائی کی رات کو دہلی پہنچے۔ ۲۶ جولائی کو احباب کے ساتھ نظام الدین اولیا کے مزار پر پہنچے اور سارا دن وہیں گزارا۔ اس دن وہاں منعقد ہونے والی محفل میں نیرنگ کے علاوہ مقبول [illegible] الٰہی نے بھی ان کی آمد کی خوشی میں نظم پڑھی تھی۔

سید حسن نظامی صاحب دام فیضہٗ مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہیؒ بزم احباب منعقد رہی۔ اِس بزم کے حاضرین میں سے خواجہ صاحب موصوف، شیخ عبدالقادر صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا، شیخ محمد اکرام صاحب جائنٹ اڈیٹر "مخزن" مولوی محمد عبدالرشد صاحب الخیری، سید جالب صاحب دہلوی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ نیرنگ

فصلِ بہار آئی پھر گلشنِ سخن میں
اک جشن ہو رہا ہے مرغانِ نغمہ زن میں
وہ مژدۂ مسرّت لائی صبا چمن میں
پھولے نہیں سماتے پھول اپنے پیرہن میں
گلشن کے سبز پوشو جھٹ پٹ سنگار کر لو
عطرِ عروس مَل دو پھولوں کے پیرہن میں
ہاں ہو نئی ادا سے سنبل کی کنگھی چوٹی
نرگس لگاتے سُرمہ چشمانِ سحر فن میں
غنچوں کو حکم دے دو دیں دادِ کجکلاہی
تیکھی ادائیں نکلیں نسرین و نسترن میں
ہر غنچہ مسکراتے ہر پھول کھلکھلائے
ہر برگ لہلہاتے رونق رہے چمن میں
ہو اہتمام ایسا آرائشِ چمن کا
باقی رہے دقیقہ کوئی نہ بانکپن میں
سروِ سہی سے کہہ دو ناچے ذرا لبِ جُو
قمری ترانہ گائے جلسہ اُڑے چمن میں

یورپ کی سیر کر کے اقبالؔ واپس آتے
خوشیاں منائیں مِل کر اہلِ وطن، وطن میں
ہے آمدِ مسرّت اقبالؔ تیری آمد
خوشیاں ہیں اہلِ دِل میں عیدیں ہیں اہلِ فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے
غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں

تربتِ جاناںؒ

(شیخ محمد نصیب صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی خاص فرمائش سے)

ہوائیں ہو گئیں خاموش وقتِ شام آپہنچا
اندھیرا چھا گیا ہر سمت عالم ہے خموشی کا
نہیں پائے صبا تک کی ذرا آہٹ گلستاں میں
اسی عالم میں آ نکلا ہوں میں شہرِ خموشاں میں
دلِ مہجور میں اک لالہ زارِ داغ لایا ہوں
میں اپنے گل کی تربت پر چڑھانے پھول لایا ہوں

اب آرامیدہ ہے اس تنگ کاشانے میں وہ مٹی
شعاعِ زندگی کل جس کے ذرّوں سے چمکتی تھی
غضب ہے ایسے حسن و ناز کا صیدِ قضا ہونا
باایں اوصافِ محبوبی تہِ تیغِ فنا ہونا

قضا اس گلبدن پر رحم کھا کر کاش ٹل جاتی
خدا کے حکم سے تحریر قسمت کی بدل جاتی

؎ "مخزن" اپریل ۱۹۰۹ء ص ۶۱-۶۲

تو گورستاں میں یوں دُکھڑے نہ روتا میں حزیں ہوکر
نہ کہتا مرثیہ یوں آج میں اندوہگیں ہوکر

مگر رونے سے کیا حاصل؟ وہ روحِ نور تو یاں سے
گئی اڑ کر کہیں اونچی مہ و مہرِ درخشاں سے
ملائک لے گئے با چشمِ گریاں اس کو جنت میں
جہاں نیکوں کی روحیں تا ابد رہتی ہیں راحت میں

یہ جرأت کس طرح سے ہو سکے انسانِ فانی کو
کہ دے الزام خالق کے نظامِ جاودانی کو
سرِ تسلیم رکھوں گا سدا خاکِ اطاعت پر
سدا راضی رہوں گا اپنے مالک کی مشیت پر

مگر دل کو برابر دُھن ہے اس گُل کے محاسن کی
رہے گی یاد اس کے حُسنِ ظاہر حُسنِ باطن کی
اسی کی یاد میں اشکِ محبت میں بہاتا ہوں
تصور کو اسی کے تختِ دل پر میں بٹھاتا ہوں

(ماخوذ)

آہنگِ عمل [1]

تجھے اے بلبلِ رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی
مگر مجھ کو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی

یہ تیرے آڑے سیدھے چار تنکے شاخِ گلبن پر
کبھی سے بجلیاں ہیں فکر میں ان کے جلانے کی

کبھی سوچا بھی ہے تجھ کو کہ اب رنگِ چمن کیا ہے؟
کبھی سوچا بھی ہے تو نے ہوا کیا ہے زمانے کی؟

یہ گلچیں، باغباں، صیاد، یہ تیرے کرم فرما
لیے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تیرے مٹانے کی

---

[1] یہ نظم مرغوب بک ایجنسی لاہور کی طرف سے کتابچے کی صورت میں شائع کی گئی تھی۔ اس کتابچے کے شروع میں ادارے کے مینیجر نے لکھا ہے:

سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے وکیل ہماری قوم کے ان بیدار مغز، عالی حوصلہ اور قابلِ تقلید بزرگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ قومی و مذہبی خدمات میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں۔ حضرت نیرنگ زمانۂ وکالت کی مصروفیات کے باوجود بھی قوم و مذہب کی قابلِ قدر خدمات بجا لاتے رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ۱۹۱۸ء میں یہ نظم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بتیسویں[۳۲] سالانہ اجلاس میں بمقام سورت پڑھی۔ اور اس کا عنوان آہنگِ عمل رکھا۔ واقعی عمل کا پیغام ہے۔ ہمیں اس پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

اس نظم کے سوز و گداز نے مسلمانانِ سورت کے مردہ دلوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ہر شعر پہ نعرۂ تحسین بلند ہوا۔ اور چندہ کی مقدار پر بھی اس کا ایک خوشگوار اثر پڑا۔

اٹھو اے نیند کے ماتو! کہ سر پر آفتاب آیا
غضب ہے گر ہے اب بھی خوابِ نوشیں کا نشہ باقی

سنبھالے اپنے پر پُرزے ترے سب ہم صفیروں نے
ہر اک نے فکر کی ہے اپنے اپنے آشیانے کی
مگر اک تو ہی غافل ہے مآلِ کارِ گلشن سے
ترے حصّے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی
نہ پھولوں کے وہ تیور ہیں نہ غنچوں کی وہ چتون ہے
خدا جانے کدھر کو اب کشش ہے آب و دانے کی
پرانے برگ و گُل سب چھانٹے جائیں گے خیاباں سے
لگی ہے باغباں کو دھُن نیا گلشن بسانے کی
نئے پودے، نئے بوٹے، نئے گلبن، نئے تختے
نئی شرطیں بنیں گی اب چمن میں آنے جانے کی
قفس بھی دام بھی معتراض بھی بالکل نئے ہوں گے
نئی ترکیب ہو گی تجھ کو پھندے میں پھنسانے کی
یہ حالت ہے تو تجھ سے باغ اب چھُوٹنے کا چھوٹا ہے
بنیں گی سازِ عبرت حسرتیں تیرے فسانے کی
اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تو بھی ڈھنگ اپنا
سماعت اب نہیں ہو گی کسی حیلے بہانے کی

نہ بایستے ترا در باغ سازِ آشیاں کردن
بسو کردی زندگی باید بحکمِ باغباں کردن

سمجھ لے ہم نفس! جو کچھ کہا میں نے اشاروں میں
سنائی ہے تجھے تیری کہانی استعاروں میں

نئی حالت ہے دنیا کی نرالا رنگِ ہستی ہے
نئے گل کھل رہے ہیں گلشنوں میں لالہ زاروں میں

جہاں کل خار و خس تھے وہ جگہ اب صحنِ بستاں ہے
مبدّل ہو گیا ہے صحنِ بستاں خار زاروں میں

مگر تیری وہی عادت وہی حالت وہی دھن ہے
نہ وہ محفل نہ وہ ساقی مگر تو ہے خماروں میں

جہاں میں جشن برپا ہیں قدومِ عصرِ حاضر کے
مگر تو ہے ابھی عہدِ کہن کے سوگواروں میں

ہر اک کشتِ امل شاداب ہے فیضِ تمدن سے
چمن تیرا ہی کملایا ہوا ہے ان بہاروں میں

نہ سمجھے اب بھی تو کوئی وہ سمجھے اپنی خوش فہمی
زمانہ کہہ چکا سب کچھ کنایوں میں اشاروں میں

تری ہستی کو اب آنکھیں ملانی ہیں تمدن سے
گئے وہ دن کہ دنیا چھوڑی اور جا بیٹھے غاروں میں

نئے حالات کو دیکھ اور سنبھل گر زندہ رہنا ہے
نہیں تو خود کو زندہ گاڑنا ہوگا مزاروں میں

غضب ہے آج تیری غفلتیں رسوائے عالم ہوں
سمجھتے تھے تجھے ہم چشم کل تک ہوشیاروں میں

خدا ہی حافظ و ناصر ہے تیری قوم بےکس کا
شمار اس کا ہے مدت سے حوادث کے شکاروں میں

اگر ہے قوم سے الفت تو کچھ کر کے دکھانا تھا
کہ کہنے کو بہت آساں ہے ہونا جاں نثاروں میں

غمِ دیدۂ و زدہ و دوشت کردہ حیرانِ تمنّاہا
گرفتہ ہمرہانت منزل سامانِ فرداہا

بچانا ہے اگر منظور تم کو قوم و ملّت کا
تو کچھ سامان کر لو اکتسابِ علم و دولت کا

نہ سمجھو قوم کو اک لفظ، یہ اک جسمِ زندہ ہے
کہ اک قانون ہے اس کے مرض کا اس کی صحّت کا

یہ بڑھتی ہے، یہ گھٹتی ہے یہ جیتی ہے، یہ مرتی ہے
جو ہے افراد کا عالم وہی ہے حال ملّت کا

قوانینِ حیات و موت قوموں پر بھی نافذ ہیں
نہیں ہے اتّفاقِ محض ہونا اک جماعت کا

بقائے قوم کو درکار ہے احساسِ جمعیت
کہ ہو جکڑے ہوئے افراد کو رشتہ اخوّت کا

شکستہ ہے جو قصرِ قوم اس کو پھر بسانا ہے
تجھے درپیش ہے تعمیر کرنا اس عمارت کا

نئے ایواں کا سامانِ عمارت بھی نیا ہوگا
بنے گا قصرِ قومی اب نرالی شکل و صورت کا

اساسِ ملک گیری پر تھا ایوانِ کہن قائم
بنا تھا اس کا ڈھانچہ سنگ و خشتِ زور و قوّت کا

مگر اب اقتصاد و علم بنیادِ تمدّن ہے
زمانہ ہے زراعت کا صناعت کا تجارت کا

ہوا جمہوریت کی چل رہی۔ ہے سارے عالم میں
کہ حاکم خود بھی ہے محکومِ دستورِ حکومت کا
بقائے قوم اور تعلیم کے اب ایک معنی ہیں
بس اب تعلیم ہی پر فیصلہ ٹھہرا ہے قسمت کا
تکلف برطرف تعلیم ہی اب ساز ہستی ہے
فنائے قوم اب لازم نتیجہ ہے جہالت کا

مس خام ست عقل و روحِ انساں علم اکسیرش
فلاحِ دین و دنیا خواب باشد علم تعبیرش

نہ رنگِ زہد باقی ہے نہ شانِ اتقا باقی
مسلمانوں میں اب ہے ادعا ہی ادعا باقی
نہ ایماں کی وہ قوت ہے نہ ہمت کی وہ رفعت ہے
نہ اگلا عزم باقی ہے نہ اگلا حوصلہ باقی
سلف کی خوبیاں ہم اپنے ہاتھوں آپ کھو بیٹھے
فقط اک رہ گیا ہے لافِ اوجِ ماضیٰ باقی
بہت کچھ نکتہ سنجی کی بہت سحر بیانی کی
مگر جو کام کرنا تھا وہ اب تک ہے پڑا باقی
عمل کا وقت ہے بس مشغلہ تقریر کا چھوڑو
کہ اب موقع نہیں ہے بحث و استدلال کا باقی
اگر کچھ کام کرنا ہے تو اب کر لو ابھی کر لو
کہ اب مطلق نہیں گنجایشِ چون و چرا باقی

نصیبِ دشمناں! مٹ ہی نہ جائے قوم کی ہستی
کمر باندھو کہ ہے کچھ وقت اب بھی کام کا باقی

اٹھو اے نیند کے ماتو کہ سر پر آفتاب آیا
غضب ہے گر ہے اب بھی خوابِ نوشیں کا نشہ باقی

بہت سا وقت ضائع کر چکے ہو اب بھی جاگ اٹھو
کہ تم سے قوم کو ہے اب بھی کچھ کچھ آسرا باقی

سنبھل جاؤ کہ شاید اب بھی وقتِ کار باقی ہے
ابھی تو ابتدا ہی ہے پڑی ہے انتہا باقی

کہیں ذکرِ تدابیرِ سفر سے راہ کٹتی ہے
قدم ہی جب نہ اٹھے گا رہے گا راستہ باقی۔

نجاتِ قوم اس میں ہے کہ ہو تعلیم عام ایسی
کہ اَن پڑھ رہ نہ جائے کوئی چھوٹا یا بڑا باقی

بیا جوشِ عمل را وقفِ کارِ قوم و ملت کن
زمانہ انتظارت کم کشد برخیز و عجلت کن

نوائے انقلاب[1]

(۱)

چل رہی ہے باغِ عالم میں صبائے انقلاب
آ رہی ہے پتّے پتّے سے صدائے انقلاب

انقلاب آئینِ ہستی ہے نہیں اس سے مفر
چلتی رہتی ہے ہمیشہ آسیائے انقلاب

زیر و بم سے ہے مرکّب زندگی کا زمزمہ
زیست کہتے ہیں جسے ہے اِک نوائے انقلاب

ذرّے ذرّے سے ہے آہنگِ تغیّر موجزن
سازِ ہستی سے نکلتی ہے صدائے انقلاب

ایک حالت پر نہیں ہے کارگاہِ ہست و بود
یعنی ہر ساعت نرالی ہے ادائے انقلاب

قطرہ گاہے بحر گاہے ابر گاہے برف ہے
کس قدر دلکش ہے حسنِ عشوہ ہائے انقلاب

---

[1] یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ خیرپور، ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو پڑھی گئی۔
اور مرغوب بک ایجنسی لاہور نے اسے کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔

ذرّہ گاہے دشت، گاہے کوہ، گاہے قصر ہے
ہے سبق آموزِ ہمّت ارتقائے انقلاب

جب تلک ہستی ہے گردش سے نہیں چھٹکارا نہیں
انتہائے زندگی ہے انتہائے انقلاب

گردشِ دوراں تنزّل کا مرادف کیوں بنے؟
کیوں ترقّی کو نہ سمجھیں مدّعائے انقلاب؟

زندگی کا راز ہے سعیِ مسلسل میں نہاں
اہلِ ہمّت کو نہیں ممکن دبائے انقلاب

باری باری ہوتے آتے ہیں سبھی زیر و زبر
تجھ کو دھوکے میں نہ ڈالے ابتلائے انقلاب

یاس تو جب ہو اگر ساکن ہو دریائے حیات
مزرعِ امّیدِ مرداں ہے فضائے انقلاب

زندگی سیلِ رواں ٹھہری تو پھر کیسا سکوں؟
قطرہ قطرہ ہے یہاں تو آشنائے انقلاب

دانہ کہتا ہے کہ مرکز سے اگر تم ہٹ گئے
پیس ہی ڈالے گی تم کو آسیائے انقلاب

تیری کوشش پر مدارِ کار جب رکھا گیا
تو بنا بیٹھا ہے کیوں برگِ ہوائے انقلاب

خود بھی کچھ کر کے دکھا گردش کی کٹھ پتلی نہ بن
جوہرِ تقلیب[1] پیدا کر بجائے انقلاب

---

[1] تقلیب پلٹ دینا ہے۔ اور انقلاب پلٹ جانا۔ فرق ظاہر ہے۔ ۔ نیرنگ

منقلب گشتن خس و خاشاک را ہم حاصل است
درخورِ اہل ہمم تدبیر کارِ مشکل است

(۲)

مدّتوں سے گو تنزّل پر ہے اپنا احتشام
اس کے یہ معنے نہیں اب ہم نہ لیں جینے کا نام
بات مت سننا کبھی پیغمبرانِ یاس کی
ہمتیں ان کی شکستہ ہیں خیال ان کا ہے خام
وہ سمجھتے ہیں مرض ہے پیش خیمہ موت کا
انحطاطِ قوم ہے گویا دلیلِ انعدام
لغو ہے یہ قول دنیا میں ہے ہر دکھ کی دوا
زخم ہے وہ کون سا جس کو نہیں ہے التیام
یہ تو یاروں نے ہمارے اک بنا رکھی ہے بات
ہے ہمارے حوصلوں کا توڑنا ان کا مرام
زہرِ اخلاقی ہے ان اقوال میں اس سے بچو
تم ہوئے بد دل تو ہوگا درہم و برہم نظام
در ہیں اصلاح و ترقی کے قیامت تک کھلے
اور پھر ہم پر کہ ہم ہیں اُمّتِ خیر الانام
اُس سے نسبت ہے ہمیں جس پر نبوّت ختم ہے
متصل ہے صبحِ محشر سے ہمارے دن کی شام

حق تو وہ شے ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا فنا
ہم ہیں اہلِ حق بھلا پھر ہم کو اور مٹنے سے کام؟
مسلکِ حق ہے وہی توحید جس کا نام ہے
حشر تک توحید کو حاصل ہے عالم میں قیام
ہم ہیں زندہ میں ہوں زندہ جب تلک قائم ہے حق
میں ہوں حق پر اور دوامِ حق ہے خود میرا دوام
تیغ زن اسلام کا پسپا کبھی ہوتا نہیں
جنگ کا انجام کچھ ہو اس کو ہے لڑنے سے کام
وہ جہاں ڈٹتا ہے پھر پیچھے نہیں ہٹتا کبھی
کھینچ کر شمشیرِ صولت توڑ دیتا ہے نیام
زندگی بھی رزم کا میداں ہے انساں کے لیے
اس میں بھی تیغِ عمل سے لے اسی جرأت سے کام
سعی اور امید کا دامن نہ چھوٹے ہاتھ سے
خواہ کچھ ہو کاہلی لکھی نہ جائے تیرے نام
تیرا ذمّہ سعی تک کا ہے نتائج کا نہیں
فرض ہی تیرا ہے اتنا کام سے رکھ اپنے کام

لَیسَ لِلاِنسَانِ اِلّا ما سَعیٰ بُرہانِ ماست
شیوۂ عزم[1] و توکل داخلِ ایمانِ ماست

---

[1] فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (الآیۃ) ۱۲ ح

(۳)

ہم نے یہ مانا کہ منظر ہے نہایت دل شکن
ہم نے یہ مانا کہ ہے نذرِ خزاں اپنا چمن
مشربِ اُمید میں افسردگی جائز نہیں
کیا عجب ہے لوٹ آئے پھر وہی عیشِ کہن
آج پت جھڑ ہے تو ہو کل پھر بہار آنے کو ہے
سبزہ و گل پھر وہی ہوں گے وہی سرو سمن
شاہدِ ہستی کی ہو جائے گی پھر کایا پلٹ
پھر وہی اگلی سی رعنائی وہی اس کی پھبن
سختیاں گر تجھ کو پیش آئیں تو ہرگز غم نہ کھا
چاند سورج کو بھی آخر لگ ہی جاتا ہے گہن
کام مردوں کا نہیں مشکل میں ہمت ہارنا
ہے ہنسی اس میں جگت کی اور اپنا ہے مرن
پائے استقلال طے کر لے گا آخر راہ کو
کیسی ہی ٹیڑھی ہو گھاٹی کیسی ہی منزل کٹھن
کوہ کی رگ رگ سے جوئے شیر بہ نکلے اگر
ہاتھ میں تیشہ ہو اور دل میں ہو عزمِ کوہ کن
درد پیدا کر اگر بننا ہے رہبر قوم کا
سوزِ دل ہے شرط گر بننا ہے شمعِ انجمن

بات میں تاثیر تب ہو درد جب پہلو میں ہو
سوز ہو پیدا سخن میں ہو اگر دل میں جلن

ہم کو جب تک حس نہ ہو سود و زیاں کچھ بھی نہیں
ہم پہ ہو غم خوار نالاں یا ہو دشمن خندہ زن

ذلتِ قومی کا بھی احساس کچھ پیدا کرو
اپنے اپنے حال میں کب تک رہو گے تم مگن

اس زمانے میں نئی تعلیم سے چارہ نہیں
چاہیے سکہ وہی دنیا میں ہے جس کا چلن

ہو عجب انداز سے آرائشِ لیلائے علم
ایشیائی ہو متانت اور فرنگی بانکپن

ذوق ہو یورپ کا اور اخلاق ہو اسلام کا
مشرقی ہو تربیت اور مغربی ہوں علم و فن

ایک ہی گل میں ہو سامانِ نشاطِ چشم و روح
رنگِ تعلیمِ جدید و بوئے تہذیبِ کہن

عقل تو از علمِ حاضر جامِ صہبائے کشد
جان تو از کوثرِ اسلام مینائے کشد

دردِ پنہاں[1]

ہم نشیں مجھ سے نہ سُن دردِ دروں کا ماجرا
پھر نہ کہنا تُو نے محفل کو مکدّر کر دیا
تجھ کو یارائے شنیدن مجھ کو تابِ گفتگو
جب تلک دونوں نہ ہوں، بے سود عرضِ مدعا
مجھ کو چھیڑا ہے تو میری صاف گوئی ہو معاف
دب کے میں نے گو مگو میں کچھ کہا تو کیا کہا؟
سازِ غم ہوں مجھ سے نکلیں گی صدائیں درد کی
دِل میں جو کچھ ہے وہی آخر زباں پر آئے گا
اب نہیں اشک و فغان و آہ کے بس کا یہ روگ
اور ہی کچھ چاہیے اظہارِ غم کا سلسلہ
قلبِ ملت بن رہا ہے کوہِ آتش خیزِ غم
ہے[2] اُبل پڑنے کو لاوا، آ رہا ہے زلزلہ

---

[1] یہ نظم میر نیرنگ نے "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے ۳۴ ویں اجلاس منعقدہ ۱۹۲۰ء امراوتی (برار) میں پڑھی تھی۔

[2] آتش خیز پہاڑوں سے جب مادہ آتشیں نکلنے کو ہوتا ہے تو پہلے سخت زلزلہ آتا ہے پھر وہ مادہ آتشیں نکلتا ہے جس کو لاوا کہتے ہیں۔ (نیرنگ)

سوزِ غم سے لفظ و مضموں ہو گئے خاکِ سیاہ
داستانِ دردِ پنہاں کس طرح کیجے ادا
سیکڑوں اپنی بہاریں یوں تو ہمدم لٹ چکیں
خرمنوں پر اپنے گرتی ہی رہی برقِ بلا
سلطنت بن بن کے بگڑا کی برسم انقلاب
لکھتے آتے ہیں سخن ور مرثیے پر مرثیہ
سارے واویلے وہ قبل از مرگ تھے اے ہم نفس
آج ہونا چاہیے اِک محشرِ ماتم بپا
سخت درد انگیز ہے اے ہم نشیں تیرا سکوں
کیا نہیں معلوم تجھ کو کیا ہوا کیونکر ہوا؟
ہم نے یہ مانا تلافی کا نہیں یارا تجھے
تلملا اٹھنا تڑپ لینا تو تیرے بس میں تھا؟
سلطنت مٹتی تھی پہلے، آج ملت مٹ گئی!
ایسا یومِ نحس ان آنکھوں نے بھی دیکھا نہ تھا!
میں کہ گاتا تھا سرودِ سعی و اُمّیدِ عمل
آج میرا ساز ہے لبریزِ آہنگِ عزا
دل لے حسرت! چل بسا آخر وہ بیمارِ فرنگ!
موت کے بستر پہ جو صدیوں سے تھا دم توڑتا!
کوندتی پھرتی تھیں جو صدیوں سے اس کی تاک میں
بجلیاں وہ گر چکیں، وہ آشیانہ جل چکا!

اب بتا اے عندلیبِ بے نوا! کس دھن میں ہے

چار[1] تنکے اپنے اب رکھّے گی کس ٹہنی پہ جا؟

سلطنت ہی مٹ گئی ہوتی تو چنداں غم نہ تھا

شامتِ اعمال یہ ہے دین زد میں آگیا!

اِک زمانہ تھا حرم میں امن تھا ہر صید کو

وائے عبرت! خود حرم اب صیدِ اعدا ہو گیا!

بانیِ کعبہ کا بیٹا بن گیا کعبہ فروش!

الغیاث اے ربِّ کعبہ! کفر کعبے سے اُٹھا

خادمِ کعبہ نصاریٰ کا بنا تنخواہ خوار!

آہ! ذلت کی بھی ہوتی ہو گی کوئی انتہا!

اے مسیحائے مدینہ! آپ سے فریاد ہے!

قلب پر اسلام کے ہے کفر کا فالج گرا!

آخر آ برسا عرب پر بھی تمدّن کا سحاب!

اب چلے گی مغربی تہذیب کی ٹھنڈی ہوا

ایشیائے کوچک و شام و عراق و ارضِ روم

سب پہ اس ابرِ بہاراں کا ہے اِک چھینٹا پڑا

دُھل گیا رنگِ تنزل، بہ گئی گردِ جمود

اب چمن زارِ ترقی سو بسو ہو گا کھِلا

---

[1] ملاحظہ ہو میری نظم آہنگِ عمل (دسمبر ۱۹۱۸ء):

یہ تیرے آشیانے سیدھے چار تنکے شاخِ گلبن پہ — کبھی سے بجلیاں ہیں فکر میں ان کے جلانے کی

——— نیرنگ

ملک سے اجناس اب کثرت سے باہر جائیں گے
روز افزوں ہو گی خورشیدِ تجارت کی ضیا
خوب مصنوعاتِ مغرب کی کھلیں گی منڈیاں
اب ہزاروں ہی بنیں گے آڑھتی تاجر نما
ملک مالا مال ہو گا سکۂ قرطاس سے
بے زری کے منھ پہ ہو گا غازۂ ثروت ملا
بادۂ مغرب کی آئیں گی کروڑوں بوتلیں
کوچہ و بازار میں بکتی پھریں گی برملا
آتشِ سیال سے ایماں جلائے جائیں گے
حسنِ ساقی کی چمک پر مر مٹیں گے پارسا
مدرسے کھل جائیں گے، کالج بنیں گے ہر طرف
علم و فن کا نام آئے گا زباں پر بارہا
عقل و قلب و روح کی کایا پلٹ ہو جائے گی
فطرتوں کو اور ہی سانچے میں ڈھالا جائے گا
وحشیانہ سرکشی، کہتے ہیں حریت جسے
وہ تعصب، نام ہے جس کا کہ دیں داری کھا
وہ خیال و عقل کی تنگی و تاریکی جسے
کہہ دیا کرتے ہیں پاسِ دین و شرع و اتقا
سب کے سب روشن خیالی سے بدل جائیں گے اب
اک مہذب چیز بن جائے گا ہر چھوٹا بڑا

شیو کرنا آتے گا کپڑے پہننے آئیں گے
کھانا پینا سیکھ لے گا وحشیِ آدم نما
جنگجوئی اور خونخواری سے پاتے گا نجات
قدرِ امن و عافیت پہچاننے لگ جاتے گا
اہلِ مغرب کی غلامی پر کرے گا دل سے ناز
صدقِ نیت سے کرے گا فیشنوں کا اقتدا
دین و ایماں تک کرے گا نذرِ سودائے خطاب
ایک تمغے کے لیے دے دے گا جان مبتلا
الغرض قومی خصائص سب کے سب مٹ جائیں گے
نسل رہ جاتے گی قومیت مگر ہو گی فنا [1]

مٹ رہا ہے، مٹ گیا ہے اس طرح اسلام آہ!
لیکن اپنا حال ہے اب بھی وہی وا حسرتا!
پھانس تک کا بھی نہیں احساس ہم کو اے عجب!
قلب میں ہر چند زہر آلود بھالا ہے کھبا!
یا تو غفلت ہے کہ دنیا کی خبر ہی کچھ نہیں
یا خبر تو ہے، مگر مبہوت غم نے کر دیا
لڑ رہے ہیں صلحِ ترکی پر مسلمانانِ ہند
جنگ کا واں خاتمہ ہے اور یہاں رن ہے چھڑا

---

[1] لسان العصر حضرت اکبر مدظلہ فرماتے ہیں،

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتا ہے ۔۔۔ مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتا ہے

نیرنگ

زندہ مردہ بھائیوں سے اک لڑائی ہے ٹھنی!
ایک ہنگامہ ہے برپا قطعؔ[1] اور تکفیر کا!
ٹھنڈے دل سے سوچ لیتے کاش کچھ تدبیر کار
خوبیِ تقدیر! یاں ہے دور دورہ جوش کا
بے زری تو تھی، مگر دیکھو تو افلاسِ خیال
کیا کریں؟ کیوں کر کریں؟ اس کا نہیں مطلق پتا
مارے مارے پھر رہے ہیں چاروں جانب راہرو
پھر یہ ہے راستہ ہر رہنما کا ہے جُدا
ایک کو ترکِ موالاتِ نصاریٰ میں غلو
دوسرا انگریز کے اک اک اشارے پر فدا۔
ایک تعلیمِ مروّج کو سمجھتا زہر ہے
دوسرا کہتا ہے یہ ہے عین اکسیرِ شفا!
ایک کو ہے اتحادِ مسلم و ہندو کی دھن
دین بھی اس میں اگر جائے، نہیں پروا ذرا!
دوسرے کو بدگمانی ہے کہ اس تعمیر کی
رکھ رہے ہیں رہبرانِ ملک پانی پر بنا
اس کی وہ سنتا نہیں اور اس کی یہ سنتا نہیں
اپنا اپنا ساز ہے اور اپنا اپنا زمزمہ!

---

[1] قطع سے مراد بائیکاٹ۔ نیرنگ

کاش دونوں کی ہم آہنگی کی کچھ تدبیر ہو:

دونوں جانب عارضہ ہے افراط اور تفریط کا
مِل کے کوئی کام کیجیے گا تو ہوگا کامیاب

شور و شیون ہی سہی لیکن وہ ہو سب کی صدا
ہے جبھی کارِ جماعت کے لیے چشم فلاح

ہوں وسائل متفق اور متحد ہو مدعا
فائدہ کیا جب کہ الصاقِ اخوّت ہی نہ ہو؟

آپ ہوں تعداد میں ذرّاتِ صحرا سے سوا
ریت اور چٹان دونوں کا ہے ذرّوں سے وجود

اک اٹل اور دوسرا بازیچہ موجِ ہوا!
جڑ اخوّت کی ہے ایماں لیجیے اس کی خبر

ضعفِ ایماں ہی سے ضعفِ قوم کی ہے ابتدا
ضعفِ ایماں ہی سے افلاسِ عمل کا ہے ظہور

دشمن کے پکّے ہو نہیں سکتے کبھی اہلِ ریا
پہلے کر اللہ سے تجدیدِ میثاقِ الست

پھر رکھ اس میثاق پر ہر کارِ قومی کی بنا

شرطِ زندگی[۱]

تجھ کو اے مسلم ہے اپنے حال کا کچھ بھی پتا؟

کس طرف جاتا تھا تجھ کو اور کدھر ہے جا رہا؟

کون سی دولت کا تو وارث تھا اور وہ کیا ہوئی؟

کس نے لوٹا کارواں کو تیرے اور کیا کیا لٹا؟

آہ اے مسلم! تری غفلت کو کیا کیا روئیے!

کیسی تیری ابتدا تھی! کیا ہے تیری انتہا!

کون رہبر ہے ترا؟ اور اس کا کیا فرماں ہے؟

کیا ہوئی تعمیلِ فرماں اور ہوا انجام کیا؟

تیرا رہبر وہ ہے جو ہے مقتدائے جن و انس

تیرا رہبر وہ ہے جو ہے رہبروں کا رہنما

آسماں کو یاد ہیں وہ دن کہ کفر و شرک سے

ایک اندھیرا ضلالت کا جہاں میں چھا گیا

---

[۱] یہ نظم مرغوب ایجنسی لاہور کی طرف سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ اس ادارے کے مینیجر نے یہ تمہیدی سطور لکھی ہیں:

بہ زمانۂ فتنۂ ارتداد۔ یہ وہ دردناک نظم ہے جو جناب سید غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اڑتیسویں سالانہ جلسے (منعقدہ یکم اپریل ۱۹۲۴ء) میں پڑھی۔ جس وقت میر صاحب نظم پڑھ رہے تھے، اس وقت ایک عجیب سناٹے کا عالم تھا۔ سامعین نے نہایت توجہ اور دلچسپی سے اس نظم کو سنا۔ حاضرینِ جلسہ میں شاید ہی کوئی دل ایسا ہو گا جو متاثر نہ ہوا ہو۔ اس دلگداز نظم میں جو درد اور تاثیر ہے ہر دل محسوس کر سکتا ہے۔

دین اور اخلاق دنیا بھر سے رخصت ہو گئے،
ایک طوفانِ فساد و شرّ و طغیاں تھا بپا
بن گئے معبود دو اور تین کسی، تینتیس ۳۳ کروڑ
ہر طرف گمراہیوں کی چھا گئی کالی گھٹا
ظلمتِ باطل میں جب ملفوف دنیا ہو گئی
صورتِ انساں میں نورِ حق ہوا جلوہ نما
ہو گیا تھا جس کو ابراہیم کا دستِ دعا
بطنِ وادیٔ غیرِ ذی زرع سے وہ دانا آگا
ریگ کے ذرّوں میں چمکا اک درخشاں آفتاب
چشمِ باطل کو چمک نے جس کی خیرہ کر دیا
حکمت و عرفاں کا وہ خورشید جس کے سامنے
ہر زمانے کے نبی کو چاند کا رتبہ ملا
جس کا فرمودہ ہے ہر عاقل کا دستور العمل
ہے صحیفہ جس کا اک سرچشمۂ آبِ بقا
جسم و عقل و روح کی بہبود کے ساماں تمام
کر دیے جس نے بہم از ابتدا تا انتہا
نوعِ انساں کو سکھایا اُس نے آ کر صاف صاف
کیا ہے قانونِ بقا اور کیا ہے آئینِ فنا
دے کے دستورِ حیاتِ انفرادی کا سبق
اجتماعی زندگانی کا بھی گُر بتلا دیا

تجھ کو بھی کچھ یاد ہے وہ گُر ہے کیا؟ "تبلیغِ حق"
ملّتِ اسلام کا جس سے ہوا نشو و نما

حاملِ حق کے لیے تبلیغ ہے "شرطِ حیات"
اس لیے ہے امر بالمعروف کا فرماں ملا

جذبۂ تبلیغ سے ملّت کی ہے بالیدگی
سُوکھ جائے گا وہ پودا جس کا بڑھنا رُک گیا

اِتحادِ جسم و جاں تک ہی نہیں ہے زندگی
رُوح مُردہ ہے تو تُو ہے مُردۂ زندہ نما

تُو اگر مسلم ہے تو اسلام تیری رُوح ہے
بڑھتے رہنا رُوح کا ہے تیرا سامانِ بقا

تجھ کو خود زندہ اگر رہنا ہے، پھیلا زندگی
ورنہ کر لیں گے ہڑپ تجھ کو جراثیم فنا

آہ! صدیوں سے بھلا رکھا ہے تو نے وہ سبق
تیری خاموشی نے باطل کا بڑھایا حوصلا

اس لیے باطل کو دعوت کی جسارت ہو گئی
شیوۂ دعوت الیٰ الحق ترک تم نے کر دیا

روشنی میں اور تاریکی میں نسبت ہے یہی
منھ چھپایا جب اُجالے نے تو اندھیرا بڑھا

اُٹھ تو اے غفلت کے متوالے ذرا ہشیار ہو
دیکھ تو یہ چل رہی ہے کیسی زہریلی ہوا

سازو ساماں لٹ چکا تھا، جان کے لالے ہیں اب
سلطنت تو مٹ چکی تھی، دین بھی مٹنے لگا
آج کھل کھیلا وہ آخر جس بُتِ عیّار[ٹ] نے
جامعِ دہلی میں تھا بہروپ واعظ کا بھرا
کل تلک دیتا تھا جو ہم کو صلاحِ اتحاد
آج وہ یارِ وطن دیتا ہے پیغامِ فنا
کھول کر آغوشِ الفت ہم سے ملتا تھا جو کل
آج دیکھا آستیں میں اُس کی خنجر تھا چھپا
کیا ہماری نزع کی سی زندگی بھی شاق ہے
یار دینے آئے ہیں ہم کو پیالہ زہر کا
ایک آفت ایک شامت ہو تو اس کو روئیے
ہے مصیبت نت نئی ہر روز فتنہ ہے نیا
شامتِ اعمال تیری آنکھ کھلتی ہی نہیں
جب تلک سر سے گزر جائے نہ سیلابِ بلا
زندہ رہنا ہے اگر تبلیغ کر تبلیغ کر
خویش ہو بیگانہ ہو پیغامِ حق سب کو سُنا
میں نہیں کہتا کہ تو سوراج کا طالب نہ ہو
میں نہیں کہتا کہ اخوانِ وطن سے رہ جدا
میں نہیں کہتا کہ میثاقِ سیاسی توڑ ڈال
میں نہیں کہتا کہ بن بیگانۂ رسم وفا

ٹ مہاتما گاندھی کی طرف اشارہ ہے جنھیں تحریکِ خلافت کے دوران جامع مسجد دہلی میں مسلمانوں سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

دعوت سعی و عمل ہے یہ بلاسے ارتداد
ردِّ عمل کی بات کیا ہے تو بھی کچھ کر کے دکھا
جوششِ غیرت چاہیے، جوشِ غضب بیکار ہے
ہو حمیت دل میں پیدا، دیدۂ عبرت ہو وا
شوق سے اہلِ وطن کے ساتھ مِل کر کام کر
ملک کا جو حق ہے تجھ پر اُس کو بیشک کر ادا
یاد رکھ لیکن کہ ہے اسلام ہی ہستی تری
حملۂ جذب و فنا سے اپنی ہستی کو بچا
حُبِّ حق حُبِّ وطن سے ہے مُقدّم بالیقیں
چھوڑ کر حق کو جو آزادی ملی تو کیا ملا!
ایک قیدِ حق پہ ہیں آزادیاں لاکھوں نثار
سامنے یوسفؑ کے اعزازِ عزیزِ مصر کیا؟
ہرچہ خواہی کن، مگر از نشترِ حق غافلِ مباش!
مثلِ موجِ مضطرب شو، صورتِ ساحلِ مباش!

کارزارِ ہستی

عجب جائے اماں عہدِ کہن میں بزمِ ہستی تھی
فضائے بحر و بر کیا ایک بےفکروں کی بستی تھی

زمانہ تھا وہ گویا حضرتِ انساں کی طفلی کا
لڑکپن کا سا بھولاپن لڑکپن کی سی مستی تھی

نہایت مختصر تھیں خواہشیں کیا اور ضرورت کیا
ہر اک شے مفت مِل جاتی تھی مہنگی تھی نہ سستی تھی

ذرا سی بھی کوشش کی تو جو چاہا وہ حاصل تھا
کہ گویا آسماں سے آپ کی روزی برستی تھی

ہر اِک انساں ہر اک انساں کا ہر صورت سے ہمسر تھا
بزرگی تھی نہ خُردی تھی بلندی تھی نہ پستی تھی

کوئی ان میں تونگر تھا نہ کوئی ان میں مفلس تھا
نہ رنگِ مال مستی تھا نہ شانِ فاقہ مستی تھی

غلامی اور آقائی سے تھی ناآشنا دنیا
نہ اس کی زیر دستی تھی نہ اس کی چیرہ دستی تھی

نہ ملک و قوم کا قصہ نہ رنگ و نسل کا جھگڑا
نہ جوع الارض کا چسکا نہ خوئے زر پرستی تھی

یہ نظم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی ۱۹۲۷ء میں پڑھی گئی تھی۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کا ترانہ تھا
کسے را با کسے کارے نباشد کا زمانہ تھا

پھر آخر رفتہ رفتہ اور ہی دورِ زماں آیا
گئی وہ سادگی کی رَو، نیا سیلِ رواں آیا
قدم رکھا جہاں میں آ کے تہذیب و تمدن نے
جلو میں ان کی عقل و علم و فن کا کارواں آیا
جو زیرک تھا کیا قابو میں اس نے سادہ لوحوں کو
جو تھا شہ زور کمزوروں کا بن کر حکمراں آیا
گھر لئے بن گئے۔ ذاتیں بنیں، قومیں ہوئیں قائم
ہوئے رخصت بنی آدم، فلاں ابنِ فلاں آیا
لگی محسوس ہونے ملک و مال و جاہ کی خوبی
بڑھے حرص و ہوا، ہنگامِ قدرِ بحر و کاں آیا
بچھایا دامِ حرص و آز اپنا چلتے پرزوں نے
پھنسا پھندے میں ان کے سامنے جو بے زباں آیا
لگا ہونے نمایاں فرق انساں اور انساں میں
ہوئی تفریق قائم امتیازِ این و آں آیا
غرض ہر سو خیال و مدعا کا اک تلاطم تھا
زمانے بھر میں اغراض و مقاصد کا تصادم تھا

جہاں میں آج بھی ہمدم وہی طوفاں برپا ہے
یہ دنیا کیا ہے ٹکراتی ہوئی لہروں کا دریا ہے

توافق چاہیے ماحول میں اور تیری حالت میں
اسی طوفان کی موجوں میں تیرا ابھی بسیرا ہے
گئے وہ دن کہ تجھ کو ناز تھا بے دست و پائی پر
مری جاں اب تو جینے سے عبارت کام کرنا ہے
گئے وہ دن کہ تھی سب بے مدعائی داغِ ہمت
کہ اب معیارِ عالی ہمتی جوشِ تمنا ہے
ضرورت نے بدل ڈالا ہے آئینِ عمل یکسر
جو کل حرص و ہوا تھا آج ہمت کا تقاضا ہے
ٹھہرنا لفظِ مہمل ہے زبانِ ملکِ ہستی میں
یہاں بڑھنا ہی بڑھنا ہے نہیں تو پیچھے ہٹنا ہے
ذرا ٹھہرا کوئی اور پس گیا قوموں کے ریلے میں
یہاں جینے کا ساماں ہی قدم کا بڑھتے رہنا ہے
ادھر سطوت حریفوں کی کہ ہے ہر دم ترقی پر
ادھر تو ساکن و ساکت کہ حیرانِ تماشا ہے
کھڑا دیکھے گا کب تک ہم سفر کی تیز رفتاری
ترے جنبش میں آنے کی بھی آئے گی کبھی باری

یہ ہرگز مت سمجھ اب پہلی حالت ہو نہیں سکتی
وہ قوت ہو نہیں سکتی وہ شوکت ہو نہیں سکتی
نہیں موقوف قوت قوم کی تعداد و دولت پر
خصائل سے زیادہ کوئی طاقت ہو نہیں سکتی

اگر عظمت کی دشمن ہے قوتِ ایماں ہیا کر
اگر ایماں ہے کمزور عظمت ہو نہیں سکتی

بناتے عزتِ فرد و جماعت خلقِ عالی ہے
اگر اخلاق میں پستی ہے عزت ہو نہیں سکتی

جہاں گیری کیا کرتا تھا مسلم اک زمانے میں
غضب ہے تجھ سے آج اپنی حفاظت ہو نہیں سکتی

ترا سب ساز و ساماں لٹ گیا بس اک دین باقی تھا
کہ تجھ سے آج اس کی بھی حمایت ہو نہیں سکتی

کیا ساماں حریفوں نے تو باطل تک کی دعوت کا
مگر تو ہے کہ تجھ سے حق کی دعوت ہو نہیں سکتی

چلے گا کام کب تک داستانِ گوئے سلف ہو کر
دکھا دے تو بھی ان اچھوں کا اک اچھا خلف ہو کر

مقصودِ الفت

کیا مرے حسنِ دل آویز پہ تو مرتا ہے
شعلہ روئی پہ مری جان فدا کرتا ہے
یہ اگر سچ ہے تو جا مجھ سے محبت مت کر

نگہِ عشق رخِ مہرِ جہاں تاب پہ ڈال
حسنِ بے مثل کو جس کے نہ ابل ہے نہ زوال
کم سنی پر مری مائل ہے طبیعت تیری
حسنِ نوخیز سے وابستہ ہے الفت تیری
یہ اگر سچ ہے تو جا مجھ سے محبت مت کر

تیری الفت کے ہے قابل رُخِ زیبائے بہار
جس کے انمول جواہر کا نہیں کوئی شمار[1]
چاہتا ہے مجھے تو کیا مری حشمت کے لیے
دل ہے بیکل ترا میرے زر و دولت کے لیے
یہ اگر سچ ہے تو جا مجھ محبت مت کر

چاہیے تجھ کو کرے بحرِ گہر خیز سے پیار
جس کے انمول جواہر کا نہیں کوئی شمار

---

[1] جس پہ ہر سال نیا حسن نرالا ہے نکھار (تصویرِ جذبات جلد اوّل صفحہ ۵۱) مرتبہ تاجور نجیب آبادی

پیار مجھ سے ہے تجھے کیا مری الفت کے لیے
دل ہے پروانہ ترا شمعِ محبت کے لیے
یہ اگر سچ ہے تو کر مجھ سے محبت پیارے
بہتر از مہر و بہار سے دل شیدا میرا
بحر میں بھی نہیں ایسا گہرِ مہر و وفا

پیغامِ عمل

ہم نفس عہدِ سلف کی یاد خوانی ہو چکی
چھوڑ اس قصے کو، رنگیں داستانی ہو چکی

گردشِ گردوں کا شکوہ، بختِ واژوں کا گلہ
داستانِ انقلابِ دارِ فانی ہو چکی

تابکے آخر رہے گا شغلِ یادِ رفتگاں
دورِ ماضی کی بہت کچھ نوحہ خوانی ہو چکی

کام کے میدان کی اب کھائیے چل کر ہوا
یعنی سیرِ باغِ الفاظ و معانی ہو چکی

ترجمہ کیجیے عمل میں بھی اب اپنے علم کا
نکتہ سنجی ہو چکی معجز بیانی ہو چکی

آشتی کرنی پڑے گی انقلابِ دہر سے
روٹھے رہیے گا کہاں تک، سرگرانی ہو چکی

ہاں خلافِ موجِ ایں دریا شنا کردن چہ سود
خویشتن را غرقۂ بحرِ فنا کردن چہ سود

ماجرائے رفتگاں ہے گوشِ عبرت کے لیے
آپ اسے سنتے ہیں جوشِ درد و رقت کے لیے

بھولتے ہیں آپ سن کر کارنامے قوم کے
ہم سناتے ہیں یہ قصّے جوششِ غیرت کے لیے

سرگذشتِ قوم کو دیکھو نگاہِ غور سے
کیا سبق آموز منظر ہے بصیرت کے لیے

رہبرِ علم و تمدن کیوں بنے صحرا نشیں
کیا صفت زینہ بنی اس بامِ رفعت کے لیے

ان میں تھا ایثار و استقلال و عزم و اتحاد
وقف کر دیتے تھے جانیں قوم و ملّت کے لیے

ان کے آگے سدِّ اسکندر بھی اک میدان تھا
کوہ اور صحرا تھے یکساں ان کی ہمّت کے لیے

کیا حبش اور کیا عرب بس صبغۃ اللٰہی تھے سب
ہیچ تھے رنگ و نسب چشمِ اخوّت کے لیے

دست و بازو صاف کہتے ہیں زبانِ حال سے
محنت انساں کے لیے انسان محنت کے لیے

آنچہ مرداں کردہ اند امروز کردن میتواں
راہ نقش پائے ایں پاکاں سپردن میتواں

صحنِ بستاں اب بھی ہے فصلِ بہاراں اب بھی ہے
پھول خنداں اب بھی ہے بلبل غزل خواں اب بھی ہے

آج بھی ہے تخم میں خاصیتِ نشو و نمو
کشت زار و آب و باد و مہرِ تاباں اب بھی ہے

یاد رکھو لَیسَ لِلاِنسانِ اِلّا ماسعیٰ

کل جو نافذ تھا وہی آئینِ یزداں اب بھی ہے

قیس ہی پیدا نہیں ہے ورنہ دشتِ نجد میں

خارِ صحرا اب بھی ہے ریگِ بیاباں اب بھی ہے

کان اب بھی ہے وہی ہیرے نکلتے تھے جہاں

جس سے کل موتی برستے تھے وہ نیساں اب بھی ہے

آج بھی موجود ہے اگلوں کا تھا جو رہنما

وہ حدیثِ ہادیٔ بطحا وہ قرآں اب بھی ہے

طور لبریزِ تجلّی دیدۂ موسیٰ کجاست

حسنِ عذرا جلوہ پیرا وامقِ شیدا کجاست

خیر مقدم

ہم نشیں یہ کون کہتا تھا کہ مخزن چل بسا — بات یہ بھی ملتوی تھا کچھ دنوں شغلِ سخن[1]

لیجیے حامد علی خاں لکھتے ہیں لاہور سے — منعقد ہوتے کو ہے اب پھر وہی بزمِ کہن

پھر وہی سرِ خیلِ اہلِ ذوق و اربابِ ادب — شیخ عبدالقادر اس کے ہوں گے صدرِ انجمن

پہنچ گئے جن کی کشش سے بزمِ مخزن کی طرف — چار دانگِ ہند سے چوٹی کے اربابِ سخن

خاں بہادر بھی ہوئے، جج بھی ہوئے، سر بھی ہوئے — عمر بھر لیکن رہی اردو کی خدمت کی لگن

اک رسالہ ہی نہیں مخزن، یہ اک تحریک ہے — آج ہیں جس کے نتائج ہر طرف جلوہ فگن

بیسیوں اعلیٰ رسالے جس سے پیدا ہو گئے — سیکڑوں اہلِ قلم اور سیکڑوں نقادِ فن

اب زمانہ ہے کہ اس تحریک کی قوت بڑھے

یعنی عالمگیر ہو اردو کے سکے کا چلن

ہر جگہ سے اب تو اردو کو اجاڑا جائے گا — بلدۂ دہلی ہو، یا ہو لکھنؤ، یا ہو دکن

ہر طرف سے کر کے ہجرت آئے گی لاہور میں — مغربی پنجاب ہی اب ہو گا اردو کا وطن

وقت پر آئے جنابِ شیخ پھر میدان میں — ہو مبارک آپ کو اب نکتہ سنجانِ زمن

گلشنِ مخزن بنے گا پھر جہانِ رنگ و بُو

عندلیبانِ سخن پھر ہوں گے اس میں نغمہ زن

---

[1] یہ نظم "مخزن" کے جنوری ۱۹۴۹ء کے شمارے میں "مخزن" کے خیر مقدم کے طور پر شائع ہوئی تھی۔ اس کی شانِ نزول میر نیرنگ کے خط سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے مخزن کے مدیر مولانا حامد علی خاں کو لکھا تھا۔ اس خط میں حضرت شیخ سے مراد شیخ عبدالقادر، مدیر اعزازی "مخزن" ہیں۔ خط اگلے صفحے پر ہے۔

برادرم حامد علی خاں صاحب۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا مکتوب مورخہ ۲۸؍ اکتوبر یکم نومبر کو ملا۔ مضمون کے لحاظ سے اس یاد آوری کا خاص شکریہ۔ نیرنگ کا از کار رفتہ دماغ اور غبارستانِ جھنگ کا سا ماحول کہ یہاں کے سہ ماہہ قیام میں آج تک کوئی پبلک یا پرائیویٹ صحبتِ شعر و ادب نہ دیکھی، پستی، کیسے ممکن تھا کہ حضرتِ شیخ کے ارشاد کی تعمیل کی جاتی۔ وہ تو جنابِ شیخ کی جاذبیت اور "مخزن" کے نام کا جادو تھا کہ خط کو پڑھتے ہی اشعار آنا شروع ہوئے۔ موسلادھار بارش نہیں ہوئی، آہستہ آہستہ تقاطر ہوا مگر اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں، ورنہ عرصۂ دراز سے کہہ چکا ہوں:

اب تو یوں ہم سے کوئی اہلِ سخن ملتا ہے جیسے غربت میں کوئی یارِ وطن ملتا ہے

بہرحال یہ "خیر مقدم" حضرتِ شیخ [illegible] کی نذر ہے: چہ کند بے نوا ہمیں دارد

یہاں نوا کے وہ معنی سمجھیے جو "نوا [illegible]" میں ہیں۔ میں نے غبارستانِ جھنگ کا ذکر کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ خطہ رومان سے خالی نہیں رہا۔ ہیر کا مزار اسی جھنگ میں ہے۔ حضرت سلطان باہو جیسے عارف کا مزار جھنگ سے پچاس ہی میل پر اسی ضلع میں واقع ہے، مگر اس وقت تو یہاں کے لوگ ہر قسم کے ذوق سے دیکھا نہیں گیا۔ اونٹ اور لجاڑے کثرت سے دیکھے، مگر نہ سسّی نظر پڑی، نہ پنوں۔ بھینسیں بہتیری، مگر "چاک میں دا" خالی نظر آتے ہیں۔

میں راولپنڈی میں نو ماہ تک رہا۔ وہاں شعر و ادب کے خوب جھگڑے دیکھے۔ "انجمن ترقی اردو" نے ابتدا ہی میں میری عزت افزائی کے طور پر ایک پارٹی دی۔ اس میں حکامِ سول و فوج کے علاوہ شعرا کی ایک بڑی تعداد بھی۔ انھوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ مجبوراً مجھ کو کچھ پڑھنا پڑا۔ اس کے علاوہ یومِ اقبال کی صحبتیں رہیں، مشاعرے ہوئے۔ ایسا ماحول ہو تو گونگا بھی بولنے لگتا ہے۔ خدا کرے "مخزن" اب پھر پہلی سی آب و تاب سے نکلا کرے۔ "مخزن" آتا رہا تو تعجب نہیں نیرنگ بھی کبھی کبھی اس کے صفحات میں کچھ لکھا کرے۔

میرا تمام کتب خانہ اور تمام سودات انبالے میں رہ گئے۔ دماغ کو کرید کر بھی میں اس نظم کے دو ڈھائی شعر سے زیادہ نہ نکال سکا جس کی نسبت حضرتِ شیخ کا ارشاد تھا۔ ان کی خدمت میں میرا سلامِ شوق عرض کر دیجیے اور معذرت بھی۔ والسلام۔ راقم نیرنگ

قطعۂ تاریخ

(تصنیف "مختصر العروض"، مصنفہ مولانا ابو سعید شعیب مطبوعہ لاہور ۱۳۱۳ھ)

رسالہ آپ نے واللہ کیا ہے معتبر لکھا
رہِ شعر و سخن کے رہروؤں کا رہبر لکھا

اسی کا نام ہے کوزے میں دریا کا سماں یعنی
لکھا سب کچھ جو لکھا صاف لکھا مختصر لکھا

قلم کے جوہری نے جب کہ دیکھی آب و تاب اس کی
تو بحرِ اخضرِ تحقیق کا اس کو گہر لکھا

سخن دانوں نے اس کو شاہدِ بزمِ سخن سمجھا
عزیزوں نے عزیزِ خاطرِ اہلِ ہنر لکھا

جب اس نخلِ ادب کو خامۂ تواج[سلہ] نے دیکھا
سرِ جودت[۳] سے سال طبع شاخِ بارور[۱۳۱۰] لکھا

۱۳۱۳ھ

سلہ کتب میں نیرنگ کا نام یوں تحریر ہے:

"شاعر فصیح اللسان بلیغ البیان جناب سید غلام بھیک المتخلص بہ تواج متعلم سال دوم گورنمنٹ کالج لاہور"

قطعۂ تاریخ

(تحائفِ اشرفی)

اشرفی اشرفِ اربابِ شرف   پیکرِ معنی و تمثالِ جمال
در گلستانِ نبیؐ طرفہ گلے   در چمن زارِ علیؓ تازہ نہال
سروِ خوشش قامت باغِ حسینؓ   لالۂ گلشنِ سلطان جیال
صورتش صورتِ غوثِ اعظمؓ   سیرتش سیرتِ احمد بمثال
غازۂ عارضِ زیبائے سلوک   سرمۂ نرگسِ شہلائے کمال

گفتہ اش گفتۂ ہاتف از غیب   قالِ او آئینۂ چہرۂ حال
شعرِ او رشحۂ نیسانِ قدم   فی المثل از اثرِ سحرِ حلال
تازہ سازد بدلِ سنگدلاں   قصۂ نغمۂ داؤد و جبال
پیشِ آبِ گہرِ گفتارش   گہر و لعل نماید چو سفال
بارک اللہ چہ روشن دیوان   بدر از تابِ ضیایش چو ہلال

گفت نیرنگ چہ سالِ طبعش
گفتمش مطلعِ خورشیدِ جلال

۱۳۳۲ھ

خراجِ عقیدت

(نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی)

چہ موزوں اختیار ستے چہ زیبا انتخابستے
کہ تو مامور کارِ خدمتِ خیر الملل باشی

مبارک باشدت ایں منصبِ عالی ابجد رفت
صدوسی وسال زیبِ مسند علم وعمل باشی

تو آں باشی کہ دل ہائے عزیزاں آرزو دارد
کہ تا باشی بہ عالم در اماں از ہر خلل باشی

حبیبِ حضرتِ رحمان و محبوبِ دلِ مسلم
بہ حسنِ سیرت وصورت بہ گردوں مشل باشی

یہ اشعار میر نیرنگ نے ۱۳ راگست ۱۹۱۸ء کو نواب صدر یار جنگ کے نام "صدر یار جنگ" کا خطاب ملنے پر مبارک باد کے خط کے ساتھ بھیجے تھے۔ مشمولہ "صدر یار جنگ" مصنفہ شمس تبریز خاں (مطبوعہ، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء) ص ۳۲۱-۳۲۲

نذرِ سید شاہ علی حسین اشرفی ؒ

اے عارضِ تو شرحِ طوبیٰ لِمَن تَرانی
روئے تو ترجمانِ انوارِ لامکانی

اے نورِ چشمِ حیدر آرامِ جانِ قادر
اے شمعِ بزمِ اشرف شاہنشہِ زمانی

اے مصحفِ جمالت ایمانِ اہلِ بینش
وے آیۂ لقایت تفسیرِ مَن تَرانی

حسنِ ازل ز رویت ہر لحظہ جلوہ افگن
آں معنیٔ نہاں را تو صورتِ عیانی

اے من نثارِ رویت اے من غبارِ کویت
تو جانِ یک جہانی تو یک جہان جانی

نیرنگ در ہوایت صد جاں کند فدایت
او کمتریں گدایت تو خسروِ جہانی

میر نیرنگ نے یہ نظم اپنے مرشد سید شاہ علی حسین اشرفی کی نذر کی تھی۔ مشمولہ "تحائف اشرفی"
(مطبوعہ کراچی) ص ۷-۸



محبت میں مزے ہیں انتہا کے اور مصیبت بھی
یہ وہ میوہ ہے جس میں تلخیاں بھی ہیں حلاوت بھی

مرض بھی ہے مگر انساں کے دل کی ہے یہ صحت بھی
خدا دل دے تو دِل کے ساتھ دے دردِ محبت بھی

ابھی اس قامتِ رعنا نے کچھ فتنے اٹھائے ہیں
یہ لچھن ہیں تو اک دن آ ہی جائے گی قیامت بھی

لگاوٹ میں رکاوٹ ہے رکاوٹ میں لگاوٹ ہے
عجب انداز ہے عاشق سے نفرت بھی ہے رغبت بھی

علاجِ دردِ الفت ترکِ الفت تو نے سمجھا ہے
مگر اے چارہ گر خود اک مرض ہے ترکِ الفت بھی

ادھر تیغِ نگاہِ ناز ہے بے تاب برق آسا
اِدھر بے چین ہے اپنی تمنا سے شہادت بھی

یہ مانا شانِ نازِ حسن ہے جو روجفا کرنا
ستم کی انتہا بھی ہے ظلم کی کوئی نہایت بھی؟

نہ ہو اے آرزو بیدل بتوں کی سرد مہری سے
کبھی تو ہو ہی جائے گی ادھر چشمِ عنایت بھی

گل گلشن کی رعنائی ہے ہر خار بیاباں میں
مگر چشمِ تماشائی میں ہو نورِ بصیرت بھی

وطن جس کا جہاں ہو نوعِ انساں جس کا کنبہ ہو
اُسے صبحِ وطن سے کم نہیں ہے شامِ غربت بھی

مزا تو جب ہے اے تیرنگ اگر طرزِ تکلّم میں
نمک بھی ہو سلاست بھی ہو رفعت بھی ہو جدّت بھی

(مخزن، اکتوبر ۱۹۰۷ء، صفحہ ۷۱-۷۲)



ایک سے ایک کو عبرت ہو یہ ممکن ہی نہیں
کون ہے ورنہ جو دل دے کے پشیماں نہ ہوا

ذکرِ تاثیر یہ کب آہ بلب آہ نہ تھی
نالہ کب بے اثری سے مرا نالاں نہ ہوا

ہار دی "ایک نہیں" سنتے ہی ہمت تو نے
کیا ہوا شوق تجھے دست بداماں نہ ہوا

مرے حرماں کا نہیں ان کی حیا پر الزام
شوق تو ضبط سے کیوں دست و گریباں نہ ہوا

اف تری آئنہ روئی کی تحیّر زائی
کون آئینہ صفت دیکھ کے حیراں نہ ہوا

("مخزن" اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)



شفا سے کیا غرض اے چارہ گر! بیمارِ جاناں کو
مجھے یہ درد ہی اچھا ہے رہنے دیجیے درماں کو

جلایا ہے وہ خرمن آپ کی برقِ تبسم نے
کہ حسرت جس پہ گرنے کی رہی ہر برقِ تاباں کو

بلا کے منچلے مردانِ میدانِ جنوں دیکھے
کیا آباد جا کر کوہ کو، صحرا کو، زنداں کو

سیہ مستی ہے ان میں بھی ترے گیسوئے سرکش کی
کوئی دیکھے ترے سودائیانِ پابجولاں کو

اُدھر غایت عنایت کی اِدھر پایانِ مجبوری
دکھاؤں کس طرح صورت نگاہِ لطفِ جاناں کو

رہیں گے دل کے دل میں یہ، نہ نکلے ہیں نہ نکلیں گے
نہ ٹوکو میری حسرت کو، نہ چھیڑو میرے ارماں کو

کوئی ایسا تو دل میں جس کی قیمت آپ کا دل ہو
کریں گے آپ کیا اس میرے دل کی جنسِ ارزاں کو

یہ نیرنگی ہے سب نیرنگ کی تقدیر کی ورنہ
ترے کوچے کے گلشن سے کوئی کیوں جائے گلشن کو



اک ہجوم غم و کلفت ہے خدا خیر کرے
جان پر نت نئی آفت ہے خدا خیر کرے

جائے ماندن ہمیں حاصل ہے نہ پائے رفتن
کچھ مصیبت سی مصیبت ہے خدا خیر کرے

آ چلا اس بتِ عیار کی باتوں کا یقیں
سادگی اپنی قیامت ہے خدا خیر کرے

ابھی تشخیص مرض میں ہے طبیبوں کو کلام
جان ادھر در پۓ رخصت ہے خدا خیر کرے

رہنماؤں کو نہیں خود بھی پتا رستے کا
راہ رو پیکرِ حیرت ہے خدا خیر کرے

بتِ بے مہر ہے کہ دشمن دین و ایماں
مائلِ مہر و محبت ہے خدا خیر کرے

اتفاقات نہیں ہیں یہ حوادث نیرنگ
یہ تو اعمال کی شامت ہے خدا خیر کرے



کس طرح واقف ہوں حالِ عاشقِ جاں باز سے
ان کو فرصت ہی نہیں ہے کاروبارِ ناز سے
جان پر مضراب کا کھٹکا پڑے تب لطف ہے
سوز جب دل میں نہ ہو کیا فائدہ ہے ساز سے

ؔ یہ غزل رسالہ "ہمایوں" لاہور، جوبلی نمبر، جنوری ۱۹۴۷ء صفحہ ۵۲ پر مدیر "ہمایوں" میاں بشیر احمد کی درج ذیل تمہید کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ اس میں حضرتِ ہمایوں سے مراد جسٹس شاہ دین ہمایوں سے تھی، اور جن "چار یاروں" کا حوالہ دیا گیا ہے، ان کے نام علی الترتیب اس طرح ہیں: اعجاز ـــ میرزا اعجاز حسین اعجاز؛ نیرنگ ـــ میر غلام بھیک نیرنگ؛ اقبال ـــ علامہ اقبال؛ ناظر ـــ چودھری خوشی محمد ناظر۔

"رسالہ 'مخزن' لاہور کے پرچہ بابت اکتوبر ۱۹۰۱ء میں حضرت ہمایوں کی جو مشہور نظم "سیرِ چمن" چھپی اس کا مقطع یہ تھا:

اعجاز دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج — نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ
اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج — ناظر کمانِ فکر سے مار ایک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دل کشِ این چار یارِ ما
پنجاب خوش نواست ہمایوں دیارِ ما

ان "چار یاروں" میں سے آج صرف ایک جناب نیرنگ صاحب بزمِ اردو میں رونق افروز ہیں۔ ان کے تازہ "ایک دو خدنگ" ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے از رہِ نوازشِ ہمایوں کے جوبلی نمبر کے لیے ارسال فرمائے ہیں۔"

میرے دردِ دل سے گویا آشنا ہیں چوب وتار
اپنے نالے سن رہا ہوں پردہ ہائے ساز سے

ذرہ ذرہ ہے یہاں اک کتبۂ سرِ الست
آپ ہی واقف نہیں ہیں رسمِ خطِ راز سے

دل گئے، ایماں گئے، عقلیں گئیں، جانیں گئیں
تم نے کیا کیا کر دکھایا اک نگاہِ ناز سے

دل کی باتیں دل میں جب تک ہیں جبھی تک راز ہیں
ورنہ یکساں ہے کہو محرم سے یا غماز سے

آہ! کل تک وہ نوازش! آج اتنی بے رخی
کچھ تو نسبت چاہیے انجام کو آغاز سے

آپ کو شاید جنابِ شیخ پر ہو اعتماد
ہم کو تو حضرت نظر آتے ہیں کچھ دمباز سے

مختصر سی حضرتِ نیرنگ نے لکھی غزل
مدتوں کے بعد فیضِ صحبت اعجاز[1] سے

---

[1] راقم اور مرزا اعجاز حسین اعجاز مرحوم مارچ ۱۹۲۰ء میں ایک سال تک مالیر کوٹلہ میں اکٹھے رہے تھے۔ (نیرنگ)

حالی کے بعد اور اقبال کے معاصرین میں جن شعراء نے اردو شاعری میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں، ان میں میر نیرنگ کا نام سر فہرست ہے۔ اگرچہ وہ اپنی سیاسی سماجی اور مذہبی مصروفیات کی وجہ سے شاعری کو زیادہ وقت نہ دے سکے لیکن ان کے مختصر شعری سرمائے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ شعری سرمایہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب اردو شاعری کے دامن میں نئے نئے موضوعات و اسالیب سے وسعت پیدا ہو رہی تھی۔ میر نیرنگ نے اپنی شاعری میں جہاں ایک طرف قومی و ملی جذبات و احساسات کو جگہ دی ہے وہیں دوسری طرف مناظر فطرت اور مظاہر جمال سے بھی استفادہ کیا ہے۔ بعض انگریزی نظموں کو اردو میں اس خوبصورتی سے منتقل کیا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

ہمارے نقاد اور ادبی مورخ اقبال سے اتنے مسحور ہوئے کہ ان کے معاصرین کے ساتھ وہ انصاف نہ کر سکے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہیں بالکل ہی فراموش کر دیا۔ میر نیرنگ بھی انہیں فراموش شدہ شاعروں میں سے ہیں۔ سیاستدان میر نیرنگ کا ذکر ہماری سیاسی تاریخوں میں تو ملتا ہے لیکن شاعر میر نیرنگ کو ہماری ادبی تاریخوں میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے ان کا کلام عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ اس صدی کے شروع میں "کلام نیرنگ" دو مرتبہ شائع ہوا اور پھر نایاب ہو گیا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کلام نیرنگ کا ایک ایسا ایڈیشن مرتب کیا جاتا جس میں ان کا آخر عمر تک کا کلام شامل ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے میری تجویز پر اس کام کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ انہوں نے میر نیرنگ کے سارے کلام کو اس مجموعے میں یکجا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے اس کتاب پر جو فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے اس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ میر نیرنگ کے حالات زندگی اور ادبی کاموں کے بارے میں پہلی جامع تحریر ہے۔

مشفق خواجہ